تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اردو

ادبی رسالہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی میں عصری شعور

(تجزیاتی مطالعہ)

محقق

نازیہ سرور

215-FLL/MSURDU/S17

نگران

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

شعبۂ اردو۔ کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD

Accession No. TH-23135

MS
891.43905
ن 11

اردو ادب ۔ رسائل ۔ تجزیاتی مطالعہ

BL401490

Rupees 50 — ۵۰ روپیہ

......بیان حلفی......

منکہ مسماۃ نازیہ سرور دختر محمد سرور، رجسٹریشن نمبر 215-FLL/MSURDU/S17 حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان ادبی رسالہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی میں عصری شعور (تجزیاتی مطالعہ) ڈاکٹر غلام فریدہ کی زیرنگرانی اپنی محنت سے مکمل کیا ہے،، یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھا گیا ہے، نیز اس سے پہلے کسی جامعہ میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا۔ اس میں شامل تمام حوالہ جات کا اسناد موجود ہے اور میں اس مقالہ کے نتائجِ تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔

لہذا متذکرہ بالا بیان حلفی میرے بہترین علم ویقین کے مطابق درست اور حقیقت پر مبنی ہے اور کوئی امر مخفی نہ رکھا گیا ہے سند لکھ دی ہے تا کہ بوقت ضرورت کام آوے۔

العبد

دستخط معہ نشان انگوٹھا..........

نازیہ سرور دختر محمد سرور

شناختی کارڈ نمبر 34203-1732616-4

گواہ شد..........

محمد بشیر

شناختی کارڈ نمبر 38401-0388364-7

ATTEST
IQBAL MA

1887
50

29-12-2020

نازیہ سرور زوجہ محمد ذوالفقار ڈاکخانہ قاضی سٹی کھاریاں ، ضلع گجرات

34203-1732616-4

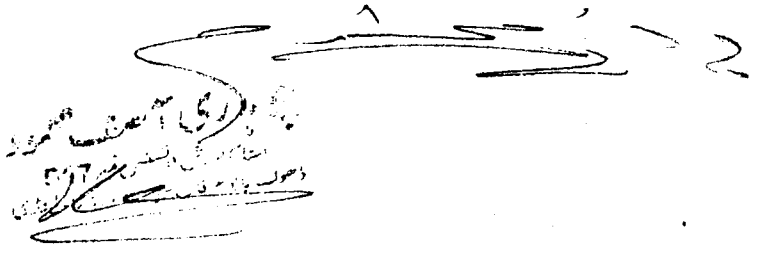

الجامعة الاسلامية العالمية
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد
شعبۂ اردو۔ کلیۂ زبان وادب

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ نازیہ سرور رجسٹریشن نمبر 215-FLL/MSURDU/S17 نے ایم۔ایس۔ اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **"ادبی رسالہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی میں عصری شعور (تجزیاتی مطالعہ)"** رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

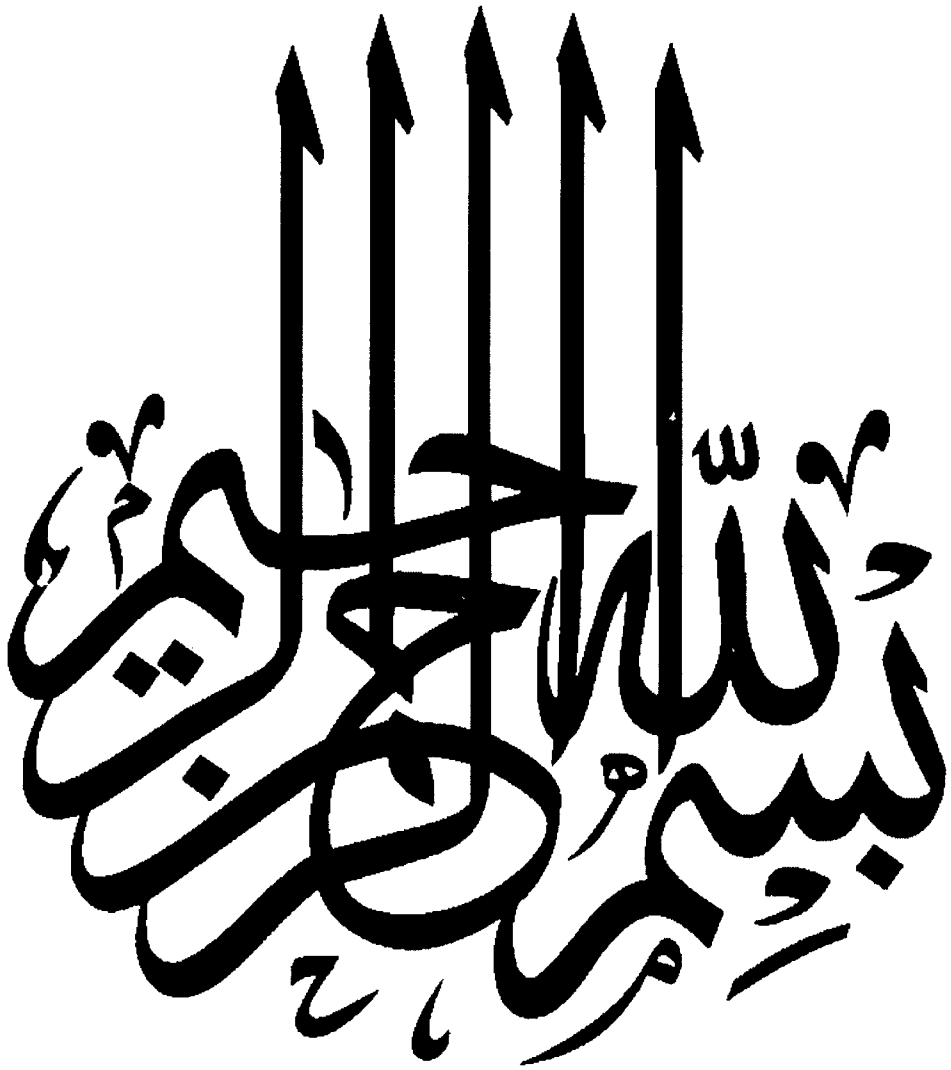
بسم الله الرحمن الرحيم

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Nazia Sarwar**

Title of the Thesis: (ادبی رسالہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی میں عصری شعور (تجزیاتی مطالعہ

Registration No: **215-FLL/MSURD/S17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Abdul Aziz Sahir
Professor
AIOU University, Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor,Department Of Urdu
Female IIUI

انتساب

اپنے ابو جی کے نام

جن کے مجھ پہ اعتماد اور دعاؤں کی بدولت آج اللہ نے مجھے یہ مقام دیا____

اظہارِ تشکر

ایم۔فل۔اردو کورس ورک کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد آخری مرحلہ مقالہ لکھنے کا تھا اور اس مرحلے کو طے کرنے کے لیے تحقیقی کام کے آغاز کا سب سے پہلا مرحلہ موضوع کا انتخاب حقیقی معنوں میں اہم اور کٹھن کام تھا۔غیر افسانوی نثر سے دلچسپی کے باعث تحقیقی کام کے لیے بھی کسی ایسے ہی موضوع کی تلاش تھی اور اس سلسلے میں صدر شعبہ ڈاکٹر نجیبہ عارف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے عصرِ حاضر کے ادبی رسالے مکالمہ کی ادبی اہمیت کے پیش نظر اس کی ادارتی پالیسی پر کام کرنے کا مشورہ دیا اور تحقیق کے اصولوں سے آگہی فراہم کرنے کے ساتھ مقالے کے لیے ابواب بندی کے متعلق راہنمائی بھی کی اور یوں مجھے مقالے کے لیے اپنی دلچسپی کا ایک عمدہ موضوع مل گیا۔ اس تحقیقی کام کی نگرانی ڈاکٹر غلام فریدہ کے سپرد تھی۔

میرے تحقیقی مقالے کا عنوان **"ادبی رسالہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی میں عصری شعور (تجزیاتی مطالعہ)"** ہے جس میں مَیں نے مکالمہ کی اشاعت سے دسمبر ۲۰۱۸ء تک کے شماروں کو منتخب کیا۔زیرِ نظر مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں ادبی رسائل کے کردار کا مختصر جائزہ اور ادبی رسالہ مکالمہ کا تعارف، مقصدِ اشاعت اور مدیر مکالمہ کا تعارف پیش کیا گیا۔

دوسرے باب کا عنوان "مکالمہ کے اداریوں میں قومی و ملکی مسائل کی پیش کش کا جائزہ" ہے۔اس باب کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔باب کے آغاز میں کسی بھی رسالے کی ادارتی پالیسی اور اداریوں کی اہمیت کو بیان کیا گیا اور بعد ازاں ذیلی عنوانات کے مطابق ادبی و فکری، سیاسی و سماجی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے تناظر میں مکالمہ کے اداریوں میں موضوعِ بحث بنائے گئے مسائل کی پیش کش، ان کی نوعیت، وجوہات اور اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ادب کی وسعت اور عالمی اہمیت کے پیشِ نظر مکالمہ کے اداریوں میں بین الاقوامی مسائل کی نشان دہی بھی ملتی ہے۔تیسرا باب میں، جس کا عنوان "مکالمہ کے اداریوں میں بین الاقوامی مسائل کی پیش کش کا جائزہ" ہے، پہلے باب کے ذیلی عنوانات کے مطابق ہی اب عالمی سطح کے مسائل کی پیش کش کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔

چوتھا باب "مکالمہ کے اداریوں میں عالمگیریت کے رجحانات کا جائزہ" کے عنوان سے ہے۔ عہد حاضر کے سب سے اہم مباحث میں سے ایک عالمگیریت کا تصور ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے مکالمہ کے اداریوں میں اس کے رجحانات پر خوب بحث ملتی ہے۔ عالمگیریت کے حوالے سے مدیر مکالمہ کے نقطہ نظر کو جاننے کے لیے اس باب میں ان رجحانات کا جائزہ لیا گیا۔

ماحصل میں ان تمام ابواب میں کیے گئے تجزیے کو سمیٹا گیا اور سوالاتِ تحقیق کے مطابق نتائج مرتب کیے۔ مقالے کو تحریر کرنے کے لیے بنیادی ماخذ یعنی مکالمہ کے شماروں کے ساتھ ساتھ دیگر کتب، ادبی رسائل، اخبارات و جرائد اور انٹرنیٹ سے اخذ و استفادہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں مدیر مکالمہ مبین مرزا صاحب کا انٹرویو بھی لیا گیا جسے مقالے کے اختتام پر بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔

اِس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے میں سب سے پہلے اس ذاتِ اقدس کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے احسن تقویم بنایا اور پھر علم کی راہوں پر چلنے والے خوش قسمت لوگوں کی فہرست میں شامل کیا۔ مقالے کی تکمیل کے اس پُر طمانیت لمحے میں اگر میں اپنے والدین کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ احسان فراموشی ہوگی۔ میرے والدین کی حوصلہ افزائی نے ہی مجھے پڑھنے کا ولولہ اور عزم دیا۔ انہی کی دعاؤں کے صدقے میں آج اس مقام پر ہوں۔ ان کے مجھ پر کیے گئے احسانات کا بدلہ چکانا ناممکنات میں سے ہے۔

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے، سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

میں شکر گزار ہوں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر نجیبہ عارف کی جنہوں نے نہ صرف موضوع کے انتخاب جیسے مشکل مرحلے میں میری راہنمائی کی بلکہ اس سے قبل جب کورس ورک کے دوران ہی بطور لیکچرار منتخب ہونے کے بعد میری تعیناتی گھر سے دور ایک کالج میں ہوئی اور ایم فل کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں اور میری تعلیم جاری رکھنے کا ایک وسیلہ ثابت ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی میں انتہائی شکر گزار ہوں نگران مقالہ ڈاکٹر غلام فریدہ کی جنہوں نے بڑے حوصلے اور کشادہ دلی سے میری نازک مزاجی کو برداشت کرتے ہوئے احسن انداز سے اس مقالے کی نگرانی کا فریضہ سر انجام دیا۔ وہ میرے تساہل کو وسعتِ ظرفی کے ساتھ مہلت فراہم کرتی رہیں۔ یہ ان کے عالمانہ ظرف کا نتیجہ ہے کہ میں آج اس مقالے کو پیش کرنے کے قابل ہوں۔ میں مدیر مکالمہ مبین مرزا صاحب کے ادبی تعاون کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے مکالمہ کے شمارے مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس تحقیقی کام میں ہر ممکن معاونت کی یقین دہانی بھی کرائی۔

میں اپنے شریک حیات محمد زین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے اس مقالے کو پایہ تکمیل تک

پہنچانے میں ہر ممکن تعاون کیا اور اس کام کو مکمل کرنے کے لیے تمام تر ممکنہ آسانیاں پیدا کیں۔ کبھی دوستانہ اور کبھی تنبیہی انداز میں اس تحقیقی کام کو تکمیل تک پہنچانے والے دوست احباب کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں ہے، مگر ان تمام مخلص دوستوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اس کام کی تکمیل پر آمادہ کیا اور کسی بھی طریقے سے میری مدد کی۔

میں شکریہ ادا کرتی ہوں جناب سید عرفان عرفی کا جنہوں نے میرے بکھرے مواد کو ترتیب کے ساتھ کمپوز کیا اور جن کے تعاون سے مقالے کی یہ صورت وجود میں آئی۔

میں شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ کی جس نے مجھے اتنے اچھے اور مخلص لوگوں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کرم فرماؤں کو خوش و آباد رکھے۔ آمین!

نازیہ سرور

دسمبر ۲۰۲۰ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	اظہارِ تشکر	
باب اوّل	**اردو زبان وادب کے فروغ میں ادبی رسائل کی اہمیت: مکالمہ کا تعارف**	۱
	۱۔ رسالہ / جریدہ	۱
	۲۔ ادبی رسائل کی اہمیت	۲
	۳۔ اردو زبان وادب کے فروغ میں ادبی رسائل کا کردار: آغاز وارتقا	۳
	۴۔ مکالمہ (تعارف)	۱۲
	۵۔ مبین مرزا (تعارف)	۱۵
	۶۔ مکالمہ کا اشاعتی سفر	۱۷
	حوالہ جات	۲۰
باب دوم	**مکالمہ کے اداریوں میں قومی وملکی مسائل کی پیش کش کا جائزہ**	۲۳
	۱۔ مکالمہ کے اداریوں میں ادبی وفکری مسائل کی پیش کش کا جائزہ	۲۶
	۲۔ مکالمہ کے اداریوں میں سیاسی وسماجی مسائل کی پیش کش کا جائزہ	۳۹
	۳۔ مکالمہ کے اداریوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل کی پیش کش کا جائزہ	۵۸
	حوالہ جات	۶۹
باب سوم	**مکالمہ کے اداریوں میں بین الاقوامی مسائل کی پیش کش کا جائزہ**	۷۴
	۱۔ مکالمہ کے اداریوں میں عالمی ادبی وفکری مسائل کی پیش کش کا جائزہ	۷۶
	۲۔ مکالمہ کے اداریوں میں عالمی سیاسی وسماجی مسائل کی پیش کش کا جائزہ	۸۷
	۳۔ مکالمہ کے اداریوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ بین الاقوامی مسائل کی پیش کش کا جائزہ	۹۸
	حوالہ جات	۱۰۵
باب چہارم	**مکالمہ کے اداریوں میں عالمگیریت کے رجحانات کا جائزہ**	۱۱۰
	حوالہ جات	۱۲۴
	ماحصل	۱۲۷
	کتابیات	۱۳۵
	ضمیمہ جات	۱۳۹

باب اوّل

اردو زبان و ادب کے فروغ میں ادبی رسائل کی اہمیت:

مکالمہ کا تعارف

باب اوّل

اردو زبان و ادب کے فروغ میں ادبی رسائل کی اہمیت:
مکالمہ کا تعارف

ا۔ رسالہ / جریدہ:

مجلاتی صحافت بھی علمِ صحافت کا ایک شعبہ ہے۔ مجلہ یا رسالہ سے مراد وہ تحریری جریدہ ہے جو ایک مقررہ مدت کے بعد شائع ہوتا ہے۔ یہ ہفت روزہ بھی ہو سکتے ہیں اور پندرہ روزہ بھی۔ رسائل ماہنامہ، سہ ماہی یا سالانہ بھی ہوتے ہیں۔ روشن آرا راؤ اپنی کتاب مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل میں اس کی تعریف یوں کرتی ہیں: "مجلہ یا رسالہ سے مراد وقفوں کے بعد شائع ہونے والا جریدہ ہے۔"[1]

ادبی جرائد کے متعلق ڈاکٹر شگفتہ یاسمین ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتی ہیں:

> عصری تناظر میں رسالے یا جریدے سے مراد رنگارنگ مشمولات پر مبنی وہ گوشوارہ ہے جہاں مضامین و موضوعات کا تنوع بھی ہے اور ہر ذوق کی تسکین کا سامان بھی، شاعری کا سوز و ساز بھی ہے اور نثر کا درد و داغ اور سائنس کی جستجو و آرزو بھی، نئے آفاق، نئے امکانات کی تلاش اور ایک عالم کی تسخیر کا ولولہ ہے تو ماضی کے دریچوں سے عظمتِ رفتہ کی بازیافت اور نقشِ کہن کی دریافت کا جذبہ بھی ہے۔ نسل جدید کو اسلاف کے کارناموں سے متعارف کرانے اور ہم عصر علوم و فنون کی جانب راغب کرنے کا حوصلہ ہے تو علم و ادب کی سرگرمیوں کا احوال اور کتابوں پر نقد و نظر بھی ہے۔ گویا مختلف خبروں، مضامین اور موضوعات کو صوری اور معنوی پیکر میں سمو کر جب ایک مجموعے کی شکل دی جاتی ہے تو اسے رسالہ یا جریدہ کہتے ہیں۔[2]

اخبار اور رسائل میں فرق کرنے والی چیز اس کا مواد ہے۔ اخبار کا مواد وقتی اور عارضی نوعیت کا ہوتا ہے جب کہ رسائل کا مواد مستقل نوعیت کا ہوتا ہے۔ رسائل میں خبر کی پیش کش کے ساتھ ساتھ اس کا تجزیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اخبار اور رسالے میں مواد کے ساتھ ساتھ اسلوب کا فرق بھی نمایاں ہوتا ہے۔ دراصل اخبار خبریت کا پہلو لیے ہوتے ہیں جہاں ہر خبر کو ایک مخصوص انداز میں قاری تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اخباری صحافت کے متعلق

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> صحافت پیشہ ہے اور اس کا شعوری عمل کسی داخلی آمد یا نوائے سروش کا انتظار نہیں کرتا۔ صحافت کے لیے ذہن کا ایک ایسا مخصوص ڈھب اختیار کرنا ضروری ہے جو خبر ملتے ہی متحرک ہو جائے اور دیکھتے ہوئے واقعے کی کہانی اخباری ضرورت کے مطابق مرتب کر دے۔[۳]

اخبارات معروضیت کا پہلو لیے ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد ادب تخلیق کرنا یا ادبی تقاضوں کو پورا کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس رسائل کے مقاصد میں ادب کی تخلیق، مختلف تخلیقی اصناف کا فروغ، ادب کے مسائل اور مباحث شامل ہیں۔ اگرچہ ایک ادیب بھی اپنا مواد زندگی کے حالات واقعات اور اردگرد سے ہی حاصل کرتا ہے لیکن اس کی تحریر مصنف کے منفرد اظہارِ ذات، قابلیت اور مختلف ذہنی نظریات کے باعث ایک مخصوص اسلوب میں ڈھل جاتی ہے، یوں رسائل کا مواد عصرِ حاضر کی ترجمانی کا فریضہ بھی سرانجام دیتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ماضی کا حصہ بن کر تاریخ کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے نیز مستقبل کے لیے رجحان سازی کا کام بھی کرتا ہے۔

۲۔ ادبی رسائل کی اہمیت:

ادبی رسائل میں تخلیقی ادب کی پیش کش، تعارف اور فروغ کو اہمیت حاصل ہے۔ رسائل میں ہر صنف ادب پر لکھا جاتا ہے اور ہر طرح کے علمی و ادبی، لسانی، تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں جن سے زبان و ادب میں جدید رجحانات اور میلانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادبی رسائل ادب کی ترویج میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اخبارات قاری کی سماجی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں تو ادبی رسائل قاری کی ذہنی ضرورتوں کی تکمیل کا باعث بنتے ہیں۔ یہ معاشرے کو ذہنی اور فکری طور پر مائل بہ ارتقاء رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ادبی رسائل میں کہنہ مشق ادیبوں کی تحریروں کے ساتھ ساتھ نئے لکھاریوں کو بھی جگہ دی جاتی ہے جہاں وہ ماہر ادیبوں کی تحریروں سے سیکھتے ہیں اور یوں ادبی رسائل نئے لکھنے والوں کے لیے تربیت کا مرکز بھی ہوتے ہیں۔ رسائل و جرائد معاصر ادبی رجحانات کو جاننے کے لیے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادبی جرائد اپنے عہد کے فکری اور تخلیقی رجحانات کی عکاسی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں یوں کسی بھی دور میں تخلیق کیے گئے ادب سے اس دور کے فکری رجحانات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور یوں ادبی رسائل اس حوالے سے اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں، اردو زبان و ادب میں مختلف ادبی تحریکوں کو جنم دینے اور پروان چڑھانے میں ادبی رسائل کا اہم کردار رہا ہے۔ بقول انور سدید:

> ادبی صحافت کے اثر و عمل کا دائرہ وسیع ہے اور رسائل و جرائد میں مختلف ادوار کی ذہنی اور فکری تاریخ ہی محفوظ نہیں ہو جاتی بلکہ ہر دور میں پروان چڑھنے والی تحریکوں اور رجحانات کا

احوال بھی رقم ہوتا چلا جاتا ہے جس سے مستقبل میں سماجی تجزیہ اور تہذیبی تحلیل میں معاونت ملتی ہے۔[۴]

۳۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں ادبی رسائل کا کردار: آغاز و ارتقا

برصغیر میں ادبی رسائل و جرائد کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ اردو اخبارات ہی دراصل اردو رسائل کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اخبارات سے خبریت کے بوجھل اثرات کو زائل کرنے کے لیے علمی و ادبی مضامین شائع کیے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا کے ادبی رسائل بھی پورے طور پر ادبی رسائل نہ تھے بلکہ کچھ ادبی رسائل ایسے تھے جو ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی رنگ لیے ہوتے اور کچھ ایسے تھے کہ جن میں ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ علمی و معلوماتی مقالات چھاپ دیے جاتے تھے۔ ابتدا کے ادبی رسائل میں علمی عنصر زیادہ اور ادبی عنصر کم ملتا ہے۔

اردو ادبی رسائل کی تاریخ اردو خبارات کے ساتھ منسلک ہے۔ کیونکہ یہی خبری صحافت ادبی صحافت کی بنیاد بنی۔ اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار جامِ جہاں نما ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔ اردو زبان میں جاری ہونے والے اس اخبار کی زبان جلد ہی فارسی کر دی گئی اور اردو ضمیمے کا اضافہ کر دیا گیا۔ لہٰذا یہ اردو و فارسی دونوں زبانوں کا اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اس اخبار میں خبروں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مضامین، تراجم، تاریخ اور شعر و شاعری بھی چھپتے تھے۔

اسی دور میں ۱۸۲۲ء میں ہی کلکتہ سے مراۃ الاخبار راجہ رام موہن رائے کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ ایک معلوماتی اخبار تھا جس کا مقصد سماجی اصلاح اور علوم کا فروغ تھا۔

۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولانا باقر نے دہلی اخبار کا اجراء کیا۔ بعد ازاں اس کی ادارت ان کے صاحبزادے محمد حسین آزاد نے سنبھالی۔ ۱۸۵۷ء میں اس کا نام تبدیل کر کے اخبارِ ظفر رکھ دیا گیا۔ اس اخبار کا مزاج ادبی تھا، اسے اردو میں ادبی صحافت کا پہلا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

> دہلی اردو اخبار کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشرتی اور سیاسی خبروں کے علاوہ غالب، ذوق، مومن، بہادر شاہ ظفر اور نواب زینت محل کے کلام کی اشاعت بھی ہوتی تھی۔ تعلیمی اداروں کی خبروں کے ساتھ ادبی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ادیبوں کے بارے میں خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی۔[۵]

دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر اسپرنگر نے ۱۸۴۵ء میں قران السعدین کے نام سے علمی ہفت روزہ جاری کیا۔ یہ ایک باتصویر مجلہ تھا جس میں سائنس، ادب اور سیاست پر مضامین ملتے ہیں۔ دہلی کالج کے نامور استاد ماسٹر رام چندر نے ادبی صحافت کو ایک نئی جہت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ۱۸۴۵ء میں پندرہ روزہ اخبار فوائد

الناظرین جاری کیا جو کہ علمی و ادبی اخبار تھا۔ مگر چونکہ اس کا مقصد خاص قسم کے قوم پرستانہ جذبات کی افزائش تھی لہٰذا عام آدمی کی توجہ اسے حاصل نہ ہو سکی۔ ستمبر ۱۸۴۷ء میں ماسٹر رام چندر نے ماہانہ ادبی صحافت کی بنیاد رکھتے ہوئے ماہوار علمی رسالہ خیر خواہ ہند جاری کیا۔ نومبر ۱۸۴۷ء میں اس کا نام تبدیل کر کے محبِ ہند رکھ دیا گیا۔ اردو رسائل کی تاریخ میں یہ رسالہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی ادبی صحافت کو ایک نئی کروٹ مل گئی۔ اس رسالے نے اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ بقول اشرف کمال:

> محبِ ہند میں یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامہ کے علاوہ بہادر شاہ ظفر اور شاہ نصیر کی غزلیں بھی شائع ہوئیں۔ محبِ ہند سے اردو ادبی صحافت کی راہیں وسیع تر ہوتی گئیں۔[۶]

ادبی جریدہ نگاری کا ایک روپ "گل دستہ" بھی ہیں، یہ اصطلاح ان رسائل کے لیے استعمال کی جاتی تھی جن کا مقصد شعر و شاعری کو فروغ دینا تھا۔ پہلا گل دستہ گلِ رعنا تھا جسے مولوی کریم الدین پانی پتی نے دہلی سے نکالا۔ گلِ رعنا میں مولوی کریم الدین کے ہاں منعقد کیے جانے والے مشاعروں کا حال رقم ہوتا تھا۔ اس گل دستے کے متعلق ساحل احمد لکھتے ہیں: "اس رسالے یا گل دستے کی جدت کو دیکھ کر ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی گلدستے جاری ہوئے۔"[۷]

اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے مولوی ابوالحسن نے ۱۹۴۸ء میں آگرہ سے معیار الشعراء جاری کیا۔ یہ گل دستہ ۱۸۵۹ء کے بعد تک چھپتا رہا۔ ۱۸۵۹ء میں بنارس سے گل دستہ گلزار ہمیشہ بہار جاری ہوا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد جہاں مسلم حکومت کا ایک باب بند ہوا، وہیں مسلم صحافت کے ایک باب کا خاتمہ اور ایک نئے دور کا آغاز نظر آتا ہے۔ مسلم صحافت پر بغاوت کا الزام لگا کر انہیں بند کر دیا گیا اور جو اخبارات و رسائل شائع ہوتے رہے وہ بھی برطانوی حکومت کے سامنے مصلحت آمیزی کا شکار رہے۔ اسی صورتحال میں ۱۸۵۹ء میں لکھنو سے اودھ اخبار کا اجراء ہوا۔ مضبوط ادبی پہلو کا حامل یہ اخبار آغاز میں ہفتہ وار چھپا، بعد میں سہ روزہ اور بالآخر روزنامہ بن گیا۔ اودھ اخبار کی ادارتی پالیسی کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> اودھ اخبار کی جہت ادبی تھی اور یہ اپنی مرنجاں مرنج پالیسی اور کشادہ نظری کی وجہ سے اتنا مقبول ہوا کہ سرسید احمد خان اور گارساں دتاسی نے بھی اس کی تعریف و تحسین کی۔[۸]

اخبارات و رسائل اپنے عہد کے ترجمان اور عصری حالات و واقعات کے عکاس ہوتے ہیں کسی بھی دور کی ادبی، تہذیبی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی فضا کو اس دور کے اخبارات و رسائل میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ بقول انور سدید: "اودھ اخبار اردو کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک بنیادی ماخذ ہے۔"[۹]

اخبارات و رسائل جہاں ایک طرف کسی عہد کے عکاس ہوتے ہیں وہیں یہ عہد سازی کا کام بھی سر انجام دیتے ہیں جس کی مثال سر سید احمد خان کا رسالہ تہذیب الاخلاق ہے جسے سر سید احمد خان نے انگلستان کے علمی و ادبی اخبارات 'ٹیٹلر' اور 'سپیکٹیٹر' سے متاثر ہو کر شائع کیا۔ سر سید احمد خان کے اس رسالے میں علمی و ادبی اور سیاسی و سماجی مضامین شائع کیے جاتے تھے جن کا مقصد مسلمانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ جدید تہذیب سے ہم آہنگ کرنا بھی تھا۔ عہدِ غلامی کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اس رسالے نے ملکی و قومی مقاصد کے حصول کے لیے پوری کوشش کی۔ اس رسالے نے مسلم تہذیب و ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے، ادب میں نئے رجحانات کو فروغ دیا اور نئی اصناف ادب کو متعارف کروایا۔ انقلاب کے بعد لاہور علم و ادب کے نئے مرکز کے طور پر سامنے آیا۔ ڈاکٹر لائیٹنر کی صدارت میں "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" قائم کی گئی۔ ۱۸۶۵ء میں اس انجمن کے تحت ایک رسالہ رسالۂ انجمن کے نام سے جاری کیا گیا اور محمد حسین آزاد اِس رسالے کے مدیر مقرر ہوئے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی صدارت میں اس رسالے کی ادبی جہت کو مضبوط کیا۔ رسالۂ انجمن میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مشاعروں کا حال پیش کیا جاتا اور ان مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظمیں اس رسالے میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ کوئی پانچ سال جاری رہا۔ انیسویں صدی کے اہم رسائل و جرائد میں شرر کا دلگداز بھی ہے جس میں تاریخی ناولوں کی سلسلہ وار اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ایک نئے ادبی عہد کا آغاز ہوا- بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں برصغیر کے اہم ادبی مراکز سے اردو زبان میں ادبی جرائد کی اشاعت کا سیلاب امڈ آیا- دہلی و لکھنؤ، لاہور، آگرہ، حیدر آباد، بمبئی اور علی گڑھ سے جاری ہونے والے رسائل و جرائد جہاں فعالیت اور رجحان سازی میں پیش پیش تھے وہیں ان جرائد نے برصغیر کے ادبی معاشرے کی علمی و فکری بنیادیں استوار کیں- شیخ عبد القادر نے اپریل ۱۹۰۱ء میں مخزن کا پہلا شمارہ شائع کیا- شیخ عبد القادر نے سیاست اور مذہبی اختلافات سے دور رہتے ہوئے ادب کی آبیاری کا سوچا اور اپنے دورِ ادارت میں اسے ایک عہد ساز ادبی جریدہ بنا دیا-وہ خود لکھتے ہیں کہ "میں نے ارادہ کیا کہ ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو مذہبی اور سیاسی بحثوں سے جو عموماً جھگڑے کا باعث بنتی ہیں، الگ رہ کر صرف ادبی خدمات تک اپنی مساعی محدود رکھے۔" ادبی رسائل نئے لکھنے والوں کے لیے ایک تربیت گاہ کا کام بھی سر انجام دیتے ہیں- مخزن نے بھی برصغیر کے طول و عرض سے کئی نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا- اور یہی نام بعد ازاں اردو ادب کے درخشندہ تاروں کی صورت چمکے-ڈاکٹر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں کہ:

مخزن ایک 'دبستان ساز اور ادیب ساز' شاعر گر ادارہ تھا۔ اس نے جن بڑے

بڑے ادبا اور شعراء کو عوام سے روشناس کرایا۔ ان میں علامہ اقبال، اکبر الہٰ آبادی، ظفر علی خان، سجاد حیدر، راشد الخیری، نیرنگ، نادر کاکوروی، داغ، آغا حشر، قزلباش، مرزا محمد ہادی اور عزیز لکھنوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[۱۱]

بیسویں صدی کی ادبی صحافت میں مخزن کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ مخزن کا اجراء کئی رسائل کی اشاعت کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور دیکھتے دیکھتے برصغیر کے طول و عرض سے کئی رسائل منظرِ عام پر آنا شروع ہوئے- لیکن ان میں چند رسائل ایسے تھے جنہیں بجا طور پر عہد ساز رسائل گردانا جا سکتا ہے-ان میں منشی برت لال درمن کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ زمانہ بھی ہے جو ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں اس کی ادارت دیانرائن نے سنبھالی۔ اس رسالے کی ادارتی پالیسی بھی عصری شعور کی حامل تھی-جہاں ایک طرف اس کے مزاج میں ملکی سیاست کا عنصر شامل تھا وہیں سائنسی موضوعات پر اعلیٰ پائے کے مضامین بھی ملتے ہیں، جو اس دور کی اہم ضرورت تھی۔ سرسید نے جس مقصدی نثر کو پروان چڑھایا، زمانہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا- منشی ذکاء اللہ، اکبر الہ آبادی، ڈپٹی نذیر احمد، منشی پریم چند، تلوک چند محروم، علامہ اقبال جیسے بڑے نام اس کے لکھاریوں میں شامل تھے۔

اسی سال جولائی ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اردو معلیٰ جاری کیا۔ ایک شاعر اور سیاستدان کی ادارت میں نکلنے والا یہ جریدہ ادب اور سیاست کا منفرد مزاج رکھتا تھا-اس رسالے نے بے لاگ تنقید کی روایت کو فروغ دیا-بقول ڈاکٹر انور سدید حسرت موہانی نے اس رسالے کو ادبی، سیاسی، تاریخی، اور تنقیدی معلومات کا خزینہ بنا دیا- حسرت موہانی کی عملی سیاست کا اثر رسالے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا اور مختلف اوقات میں یہ رسالہ بند ہوتا اور نکلتا رہا لیکن آخری بار یہ فروری ۱۹۲۵ء میں جاری ہوا۔

> مخزن، زمانہ اور اردو معلیٰ نے بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ادبی صحافت کو صحت مند کروٹ دی اور متعدد ایسے ادبی جریدے منظرِ عام پر آئے جن کا مقصد زبان و ادب کا فروغ، علمی و ادبی مذاق کی تشکیلِ نو اور مسائل کو تنقید کے انداز میں دیکھنے کا رجحان مرتب کرنا تھا-[۱۲]

بیسویں صدی کے آغاز میں شائع ہونے والے اہم ادبی پرچوں میں ایک نام الہلال کا بھی ہے جسے ۱۹۱۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے شائع کیا۔ اس سے قبل وہ کئی پرچوں کی ادارت سرانجام دے چکے تھے -مولانا ابو الکلام آزاد ایک صحافی سے زیادہ مصلح اور داعی تھے اور سیاست ان کی پہلی ترجیح تھی-یہی وجہ ہے کہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے طویل عرصے تک تسلسل سے شائع نہ ہو سکے-الہلال انقلابی نوعیت کا جریدہ تھا

جس کی ضمانت اس کے اجراء کے دو سال بعد ہی ضبط ہو گئی اور اس کا پہلا دور اختتام پذیر ہوا۔ بعد ازاں انہوں نے دو رسالے ابلاغ اور پیغام بھی جاری کیے مگر وہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوئے۔

۱۹۱۴ء میں پٹھان کوٹ سے مولانا عبدالمجید سالک کی ادارت میں شائع ہونے والا فانوس خیال بھی ایک اعلیٰ پائے کا ادبی پرچہ تھا جس میں تخلیقی ادب کی تمام اصناف کی اشاعت کی جاتی تھی مگر اردو مختصر افسانے کے فروغ میں اس کا نمایاں کردار ہے۔ لیکن یہ رسالہ جلد ہی مالی مشکلات کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔

رسالہ معارف جولائی ۱۹۱۶ء میں مولانا سلیمان ندوی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس رسالے کا مقصد مذہب و فلسفہ کی ترجمانی اور جدید تحقیق کا فروغ تھا- محققانہ مضامین کی اشاعت، تنقید اور اکابرین کی سوانح عمریوں کو مرتب کرنے کی بدولت اس رسالے کا مقام کافی بلند ہے-مولانا حالی، عبدالسلام ندوی، پروفیسر نواب علی، شیخ عبدالقادر، عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر محمد اقبال اور نیاز فتح پوری جیسے بڑے نام اس کے مقالہ نگاروں میں شامل تھے-ڈاکٹر انور سدید کے مطابق معارف کی ادبی خدمات اس دور کے متعدد رسائل سے زیادہ ہیں-

ستمبر ۱۹۱۸ء میں امتیاز علی تاج نے لاہور سے ماہنامہ کہکشاں اور پنڈت برج نرائن جکسپت نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں صبحِ نو جاری کیا- بیسویں صدی کے دوسرے عشرے تک جو رسالے منظر عام پر آئے ان میں وحید احمد زیدی کا ماہنامہ نقیب (بدایوں)، حکیم احمد شجاع کا رسالہ ہزار داستان (لاہور)، محمد دین فوق کا رسالہ نظام (لاہور)، حیدر آباد دکن سے مولوی عبدالحق کا ماہنامہ واعظ، مولوی عبدالسلام کا رسالہ انتخاب (جاورہ) اور صغریٰ بیگم کا النساء شامل ہیں۔ یہ مختصر دور کے رسالے تھے مگر ادب کے فروغ میں ان کا کردار قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۲۱ء میں انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام سہ ماہی رسالہ اردو جاری ہوا جس کی ادارت مولوی عبدالحق نے کی- تحقیقی مزاج کے حامل اس رسالے کا مقصد ادب کے گمنام خزینوں کو منظرِ عام پر لانا تھا-

اردو ادب کے عہد ساز رسائل میں ایک نام بھوپال سے جاری ہونے والا نگار ہے جسے مولانا نیاز فتح پوری نے ۱۹۲۲ء میں جاری کیا-اس رسالے کا مقصد ادب، تاریخ اور علومِ نو کا فروغ تھا-شعر و شاعری کے فروغ نیز تحقیق و تنقید میں بھی اس کی خدمات لائق تحسین ہیں-نگار کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت اس کا سالنامہ ہے جس میں کسی ایک موضوع پر ضخیم رسالہ شائع کیا جاتا تھا-اس خاص نمبروں کے ذریعے کئی شعراء کی خدمات کو از سرِ نو سراہا گیا- جنوری ۱۹۲۲ء میں میاں بشیر احمد نے لاہور سے ہمایوں جاری کیا-اس کے مدیروں میں بالترتیب مولانا تاجور نجیب آبادی، یوسف ظفر، مظہر انصاری اور ناصر کاظمی شامل رہے۔ ہمایوں کو اس دور کے اعلیٰ پائے کے

لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا اور اس نے اردو ادب کی تمام اصناف کے فروغ کے لیے خدمات سر انجام دیں۔

حکیم یوسف حسن نے جولائی ۱۹۲۴ء میں لاہور سے نیرنگِ خیال جاری کیا-اس کا مقصد قوم کے احاطۂ نظر کو وسعت دینا اور مہذب دنیا کے ہر شعبۂ خیال کو ادبی لباس میں پیش کرنا تھا- یہ اپنے عہد کا مقبول اور طویل العمر رسالہ شمار ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت کے باعث یہ رسالہ پنجاب میں ادبی ذق کو بڑھانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوا۔

نیرنگِ خیال کی ایک خصوصیت اس کے خاص نمبر تھے-سال کے بعد جو خاص نمبر شائع ہوتا تھا اس کے لیے سالنامہ کی اصطلاح بھی حکیم یوسف خان کی وضع کردہ ہے- قیامِ پاکستان کے بعد نیرنگِ خیال کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو گیا، مالی مشکلات بڑھ گئیں اور اس رسالے کے عروج کا دور ختم ہو گیا- حکیم یوسف حسن کی وفات کے بعد سلطان رشک کی ادارت میں اس کی دوبارہ اشاعت شروع ہوئی مگر ویسا عروج حاصل نہ ہو سکا جو قیامِ پاکستان سے قبل حاصل تھا۔

اردو مجلاتی صحافت کو جو فروغ بیسویں صدی میں حاصل ہوا وہ کسی اور دور میں حاصل نہ ہو سکا۔ ہمایوں اور نیرنگِ خیال جیسے عہد ساز رسائل کے بعد کئی رسائل و جرائد شائع ہوئے جنھوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں تاجور نجیب آبادی کا ادبی دنیا(۱۹۲۹ء)، شاہد احمد دہلوی کا ساقی (۱۹۳۰ء) اور چودھری برکت علی کا ادبِ لطیف (۱۹۳۵ء) شامل ہیں۔

اردو ادب کے جدید رجحانات کے فروغ، اردو شاعری کے فروغ اور اردو افسانے کی ترقی میں ادبی دنیا کا بڑا حصہ ہے-روایت سے جدیدیت اور رومانویت سے ترقی پسندی کا سفر کرتا ساقی ایک رجحان ساز رسالہ تھا- تمام تخلیقی اصناف بالخصوص اردو افسانے، مغربی ادب سے تراجم اور ادب میں نئے تجربات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا- قیامِ پاکستان کے بعد یہ کراچی منتقل ہو گئے-اردو ادب کے فروغ میں ساقی کے کردار کو واضح کرتے ہوئے روشن آرا راؤ لکھتی ہیں:

> ادب میں یہ دور رومان پسندی کا تھا چنانچہ ساقی کی بدولت رومان پسندی اور کلاسیکی ادب کو فروغ ملا- شاہد احمد ادب میں قدامت اور جدت کے مداح تھے-ترقی پسند تحریک کے آغاز پر جدید رجحانات بھی ساقی پر نمایاں ہوئے-[۱۲]

ترقی پسند تحریک کی آمد کے ساتھ ہی ساقی کی پالیسی میں بھی تبدیلی آئی۔ اردو ادب میں در آنے والی اس نئی تحریک نے ساقی کو بھی متاثر کیا اور وقت کے ساتھ ساقی میں جو جدید رجحانات کا آغاز ہوا اُس کی نشان دہی ڈاکٹر

سجاد پرویز ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> سرورق کی تبدیلی سے ساقی کی پالیسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح یہ دہلوی متانت سے جدیدیت کی طرف اور ترقی پسند تحریک کی طرف راغب ہوا۔[۱۳]

شاہد احمد دہلوی کی وفات کے کچھ عرصے کے بعد تک یہ چھپتا رہا مگر جلد ہی اس کا سفر ختم ہو گیا اور چالیس سال ادب کی خدمت کرنے کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا- جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو چودھری برکت علی کا ادبِ لطیف (۱۹۳۵ء) ترقی پسند تحریک کا ترجمان ثابت ہوا اور ترقی پسند ادب کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔

> ادب لطیف کا سنہ اجرا ۱۹۳۵ء اور ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ سن آغاز ۱۹۳۶ء ہے۔ باوجود یہ کہ اشتراکی نظریات اس دور کے کئی ایک ادبی رسائل میں تراجم کی صورت میں شائع ہو رہے تھے لیکن ادب لطیف اپنے ابتدائی ایک دو سالوں میں ان نظریات سے بیگانہ ہی رہا اور پھر رفتہ رفتہ یہ اس رنگ میں ایسا رنگا گیا کہ مارکسی نظریات اس کا اوڑھنا بچھونا بن گئے۔ اس پرچے کی تخلیقات میں غالب حصہ ترقی پسند تنقید کا ہے-[۱۴]

اپریل ۱۹۴۵ء میں بھوپال سے ماہنامہ افکار کا اجرا ہوا جس کے مدیران صہبا لکھنوی اور رشدی بھوپالی تھے۔ ترقی پسند تحریک کے نمائندے اس رسالے کو کرشن چندر، عصمت چغتائی، اختر انصاری، غلام ربانی تاباں اور جوش ملیح آبادی جیسے بڑے بڑے ادیبوں کا تعاون حاصل تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قیامِ پاکستان تک کا عرصہ ادبی جریدہ نگاری کی ترقی کا دور تھا- اردو زبان و ادب کو حقیقی معنوں میں فروغ دینے اور جدید رجحانات کے فروغ میں اس دور کے رسائل کا مقام نمایاں ہے- ادب میں نئی اصناف کو فروغ ملا، ادب میں نئی تحریکوں کا آغاز ہوا اور اردو صحافت اور اردو ادب کے راستے واضح ہوئے۔ اردو رسائل جو اس سے قبل علم و ادب کا امتزاج ہوا کرتے تھے اب مکمل طور پر ادبی ہو گئے۔

قیامِ پاکستان سے قبل دہلی، لکھنؤ، آگرہ، حیدر آباد، بمبئی، علی گڑھ اور لاہور وہ اہم علمی و ادبی مراکز تھے جہاں سے کثیر تعداد میں رسائل و جرائد شائع ہوئے اور انہی مراکز سے نکلنے والے رسائل و جرائد نے برصغیر کی علمی و فکری بنیادیں استوار کیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جہاں ہر شعبہ زندگی میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئیں وہیں اس انقلاب نے صحافت کی بنیادیں بھی ہلائیں۔ برصغیر کے اہم ادبی مراکز ہندوستان کی تحویل میں چلے گئے اور ان علاقوں سے نکلنے والے اکثر رسائل و جرائد پاکستان منتقل ہو گئے- قیامِ پاکستان کے بعد لاہور ایک علمی و ادبی مرکز بن کر سامنے آیا مگر آہستہ آہستہ دیگر شہروں سے بھی رسائل و جرائد نکلنے لگے- پاکستان میں ادب کے فروغ میں قیامِ پاکستان سے

قبل شائع ہونے والے رسائل و جرائد نے اہم کردار ادا کیا، جو تقسیم کے بعد از سر نو پاکستان سے نکلنے لگے تھے۔

اردو زبان و ادب کے فروغ میں جن رسائل کا کردار نمایاں رہا ہے ان میں سے ایک نام سہ ماہی اردو کا بھی ہے۔ ابتداء سے ۱۹۳۶ء تک اور بعد ازاں ۱۹۴۷ء تک دہلی سے نکلنے والا یہ رسالہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی متحدہ ہندوستان میں اپنا ایک شاندار دور ختم کر چکا مگر مولوی عبدالحق نے قیام پاکستان کے فوراً بعد انجمن ترقی اردو پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور جون ۱۹۴۸ء میں اسے از سر نو شائع کرنا شروع کر دیا۔ رسالہ اردو کے پاکستانی دور نے اپنے سابقہ دور کی روایت کو برقرار رکھا۔

> رسالہ اردو کا پاکستانی دور اس کے سابقہ دور کی طرح تابناک ہے۔ اس نے زبان و ادب کے گم شدہ خزینوں کی تلاش میں گہری دلچسپی لی۔ شعراء کے فن اور نظریات کو نئے علوم کی روشنی میں پرکھا۔ ان کے حالاتِ حیات کی صحت مندانہ جانچ پڑتال کی۔ پرانے صحائف کے متون کی درستی پر توجہ صرف کی، الفاظ و بیان کے مباحث کو صحت مند خطوط پر استوار کیا اور مختلف زبانوں کے درمیان تراجم کے ذریعے لین دین جاری کیا۔ اس دور میں جو گراں قدر مقالات اردو میں شائع ہوئے ان کی فہرست طویل ہے۔[۱۵]

مختلف ادوار میں انتظامی اور ادارتی تبدیلیوں کا شکار رہا مگر ہر دور میں اس کے تحقیقی مزاج پر فرق نہ آیا۔ اگرچہ اب اس کی اشاعت بے قاعدگی کا شکار ہے مگر نورالحسن جعفری کی ادارت میں یہ رسالہ آج بھی ادب کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔

جنوری ۱۹۲۲ء میں میاں بشیر احمد کی سرپرستی میں لاہور سے نکلنے والے ہمایوں نے آزادی کے بعد متعدد تبدیلیوں کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۷ء میں نئے سفر کا آغاز کیا اور ۱۹۵۲ء تک شیر محمد اختر اور بعد ازاں آخری شمارے جنوری ۱۹۵۷ء تک ناصر کاظمی کی ادارت میں جاری ہوتا رہا۔ ہمایوں نے اپنے ہر دور کے ادب کی فکری تحریکوں کے اثرات قبول کیے اور اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔

اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرنے والے رسالوں میں ایک نام نگار کے ہے جسے فروری ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے جاری کیا گیا۔ مدیر رسالہ نیاز فتح پوری کی ادارت میں پوری آب و تاب کے ساتھ بھوپال سے چھپتا رہا۔ بعد ازاں اس کی ادارت ڈاکٹر فرحان فتح پوری نے سنبھالی۔ صہبا لکھنوی کی ادارت میں نکلنے والا افکار آزادی کے بعد کراچی منتقل ہو گیا۔ افکار کا پہلا خاص نمبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا اور پھر تسلسل کے ساتھ مختلف اصناف اور ادبی شخصیات پر خاص نمبر لکھ کر ادب کی دنیا میں اپنا حصہ ڈالا۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کے ادب کے تراجم کی پیش کش بھی افکار کی عطا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کئی نئے رسائل و جرائد منصۂ شہود پر آئے اور ادب کی خدمت میں اپنا حصہ ڈالا اور کئی نئے رجحانات و نظریات کو فروغ دیا۔ ان رسائل میں نگار، سویرا، ماہِ نو، قومی زبان، نقوش، اوراق، فنون اور ادبِ لطیف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل جس تحریک نے ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ترقی پسند تحریک تھی۔ اس کے اثرات قیامِ پاکستان کے قبل کے ادب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ادبی رسائل جہاں مختلف ادبی رجحانات کی تشکیل کرتے ہیں وہیں نئی تحریکوں کے قیام اور نئے ادبی زاویوں کی تشکیل بھی رسائل و جرائد کی مرہون منت ہوتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی سے سید وقار عظیم کی ادارت میں ماہِ نو جاری ہوا، اگرچہ یہ سرکاری پرچہ تھا مگر سید وقار عظیم نے اسے ادبی جہت عطا کی اور جدید رجحانات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں محمد طفیل کی ادارت میں نکلنے والا نقوش ترقی پسند تحریک کا نمائندہ جریدہ ثابت ہوا۔ مگر ادب سے زیادہ سیاسی وابستگی کے باعث اسے چھ ماہ کی جبری پابندی کا سامنا بھی کرنا پڑا چونکہ مدیر کی سوچ اور پالیسی رسالے کی سوچ اور پالیسی ہوا کرتی ہے۔ ابتدائی دس شماروں کے بعد جب اس کی ادارت سید وقار عظیم کو سونپی گئی تو انہوں نے ادب کا رابطہ سیاست سے کم کرنے کا فیصلہ کیا اور ادب اور زندگی کا تعلق قائم کیا۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے تھے مگر اس کی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ انیسویں شمارے کے بعد یہ دوبارہ محمد طفیل کی ادارت میں واپس آیا اور اس کے ساتھ ہی نقوش اپنی ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۶ء سے یہ جاوید طفیل کی ادارت میں شروع ہوا اور تاحال ادب کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جن رسائل و جرائد نے حقیقی معنوں میں ادب کی خدمت کی ان میں ایک رسالہ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں احمد ندیم قاسمی اور حبیب اشعر کی ادارت میں لاہور سے جاری ہونے والا فنون ہے۔ فنون کو ہندوستان کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا ساتھ ملا اور یوں اپنی اشاعت کے آغاز میں ہی اس نے ادب کی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

> مدت کے بعد اردو کا ایک پورا رسالہ دیکھنے میں آیا۔ یوں تو فلک میں بلند پایہ رسالے اور بھی ہیں ان کو بھی پڑھ کر اطمینان ہوتا ہے مگر فنون رنگ و بوئے دیگر رکھتا ہے۔[۱۶]

ممتاز ادیبوں کی تخلیقات کی پیش کش کے ساتھ فنون نے نئے لکھنے والوں کو بھی متعارف کروایا اور ادب کی ہر صنف سے اردو ادب کا دامن مالا مال کیا اور تاحال اس خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔

جنوری ۱۹۶۶ء میں لاہور سے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں اوراق شائع ہوا اور اسے جدید ادب کا نمائندہ

بنانے کا عہد کیا۔ جب انہوں نے یہ رسالہ شائع کیا تو ان کے پیشِ نظر مقصد یہ تھا کہ اس رسالے کو تہذیب و ثقافت کے فروغ کا ذریعہ بنایا جائے نیز ادب کے ذریعے جذبۂ حب الوطنی کو ابھارا جائے اور اعلیٰ انسانی قدروں کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ جدیدیت کے موقف پر قائم یہ جریدہ تاحال ادبی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔

اردو زبان و ادب کے فروغ وسائل و جرائد کا کردار اہم رہا ہے۔ ادبی جرائد اپنے عہد کے فکری و تخلیقی رجحانات کی عکاسی کا فریضہ بھی سر انجام دیتے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں اردو ادب کی مختلف تحریکات کے ارتقاء میں ادبی وسائل کا کردار نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ رسائل و جرائد معاصر ادبی رجحانات کو جاننے کے لیے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب سماج کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہر دور کے فکری رجحانات اور سماجی حقیقت اس دور کے ادیبوں اور دانشوروں کے لیے خام مواد کا کام کرتی ہیں اور جو کہ پڑھنے والے کے ذوق کی تسکین کا باعث بنتے ہیں بلکہ ان جریدوں میں اس دور کے رجحانات و رویوں کی مکمل عکاسی بھی ملتی ہے۔ اردو زبان و ادب کے فروغ اور اردو ادب کی مختلف تحریکات کے ارتقاء میں ادبی رسائل کا کردار نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے اور ادبی جرائد اپنے عہد کے فکری و تخلیقی رجحانات کی عکاسی کا فریضہ بخوبی سر انجام دیتے ہیں۔ اس وقت بھی برصغیر پاک و ہند سے لاتعداد رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ یہ جرائد ادبی، نیم ادبی، سیاسی، مذہبی، سماجی اور دیگر موضوعات پر مشتمل ہیں ۔ تقسیم کے بعد سے تاحال پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد کی ایک طویل فہرست ہے لیکن چند اہم نوعیت کے جریدے عصر حاضر میں اردو ادب کی ترویج اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کتابی شکل میں شائع ہونے والا جریدہ مکالمہ بھی ہے۔

۴۔ مکالمہ (تعارف):

مکالمہ کراچی پاکستان سے شائع ہونے والا ادبی جریدہ ہے جس کے بانی اور مدیر مبین مرزا ہیں۔ مکالمہ کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۹۶ء میں اکادمی بازیافت کراچی سے شائع ہوا اور ستمبر ۱۹۹۶ء سے لے کر دسمبر ۲۰۱۸ء تک اس کے ۴۱ شمارے شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ اشاعت تا حال جاری ہے۔ موضوع کی تحدید کے باعث دسمبر ۲۰۱۸ء تک کے شمارے شاملِ تحقیق ہوں گے۔

ابتداء میں مکالمہ کو سہ ماہی رسالے کے طور پر شائع کیا جاتا تھا مگر چند وجوہات کے بنا پر اس کی سلسلہ وار اشاعت ممکن نہ ہو سکی اور اس کا دوسرا شمار تقریباً سوا سال کے وقفے کے بعد دسمبر ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ مبین مرزا رسالے کی اشاعت میں التواء کی وجوہات کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> جب مکالمے کی اشاعت کا آغاز کیا گیا تو خیال یہ تھا کہ سہ ماہی بنیاد پر نیا شمارہ لایا جائے گا لیکن ایسا

نہ ہو سکا۔ اس کی ایک اہم وجہ تو یہ تھی کہ پرچے کے لیے اشتہارات کے حصول میں وقت لگتا اور دقت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ اس معاملے میں کوئی زیادہ محنت نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے یہ مزاج کا مسئلہ تھا- تھوڑے بہت جو اشتہارات آسانی سے مل جاتے وہ بھی دوستوں کی ذاتی دلچسپی اور دوستی کی وجہ سے ملتے تھے، ہماری بھاگ دوڑ کو اس میں کچھ دخل نا تھا- جتنے پیسے کم پڑتے وہ ہم اپنی طرف سے ڈال کر رسالہ شائع کر لیتے تھے- اشاعت میں تاخیر کی دوسری وجہ کچھ اپنی سست روی بھی کہی جا سکتی ہے- اصل میں خواہش یہ تھی کہ اچھے سے اچھا پرچہ شائع کیا جائے- اچھے مواد کے حصول کے لیے اچھے لکھنے والوں سے کہنا اور انہیں وقت دینا پڑتا ہے- یوں بھی وقت لگ جاتا- پھر تیسری وجہ یہ بھی رہی کہ مکالمہ شروع سے ہی کتابی سلسلے کے طور پر شائع ہوتا رہا ہے، یعنی وہ کسی پیریوڈکل سسٹم کا پابند نہیں تھا، سو دیر سویر سے اشاعت میں کوئی دباؤ نہیں ہوتا تھا- بس یہی اسباب رہے کہ پہلے دور میں اشاعت طویل وقفوں کے ساتھ ہوئی-[۱۷]

شمارہ ۲۴ ستمبر ۲۰۱۶ء کے شمارے کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کی اشاعت ماہانہ ہونے لگی اور اب صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ ہر سال ۹ شمارے ماہانہ جبکہ دسواں شمارہ سال نامہ کے طور پر شائع ہوتا ہے اور باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

جب مکالمہ کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تو اس وقت ادب کے افق پر کئی ادبی جریدے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے تھے ایسے میں مکالمہ کے اجراء کا مقصد کیا ہے؟ اس کا سراغ مکالمہ کے پہلے شمارے کے اداریے سے لگایا جا سکتا ہے۔ "حرفِ آغاز" کے نام سے تحریر کردہ اداریے میں مدیر مبین مرزا مکالمہ کی اشاعت کے مقصد کو یوں واضح کرتے ہیں:

> فی الحال تو ہم مکالمہ کے بارے میں صرف یہی عرض کریں گے کہ اعلیٰ اور معیاری ادب کی ترویج و اشاعت ہماری اولین ترجیح ہے ہماری خواہش اور کوشش یہی ہو گی کہ اس سلسلے کی ہر اشاعت معاصر ادب کی ایک ایسی دستاویز ثابت ہو جس میں ہمارے عہد کی روح اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ بولتی ہوئی سنائی دے، جس میں فکر و احساس کی تازگی بھی ہو اور زندگی کی حرارت اور توانائی بھی اور جس میں ذوقِ ادب کی آسودگی کا سامان بھی اور خیال و نظر کی بالیدگی کا امکان بھی- مختصر یہ کہ جس کے مندرجات اردو ادب کی سمت اور رفتار و رُخ کی نشان دہی بھی کر سکیں اور زندگی کی معنویت کا سراغ بھی دے سکیں-[۱۸]

مکالمہ متنوع موضوعات پر مشتمل تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کا خوب صورت مرقع ہے۔

مکالمہ نے اپنی اشاعت سے تاحال جہاں بہت سے نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا وہیں تخلیق و تنقید کے بڑے بڑے ناموں سے بھی استفادہ کیا۔ مکالمہ نے تنقید کے حوالے سے بھی اہم کردار ادا کیا۔ کسی خاص مکتبۂ فکر سے عدم وابستگی کے باعث اس میں ہر طرح کے تنقیدی موضوعات کو جگہ دی گئی۔ عصرِ حاضر کے علَم بردار اس رسالے میں معاصر شاعری کے تمام رجحانات کو بھی جگہ دی گئی۔ حمد، نعت، نظم، غزل غرض ہر صنفِ سخن کو مکالمہ کا حصہ بنایا۔ ہر شمارے کا آغاز حمد و نعت سے کیا جاتا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کے میدان میں بھی مکالمہ کا نمایاں حصہ ہے۔ انتظار حسین، اشفاق احمد، اسد محمد خان اور زاہدہ حنا جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانے مکالمہ کے صفحات کی زینت بنے۔ مکالمہ نے کسی خاص مکتبۂ فکر سے وابستگی کے بغیر اردو افسانے کے فروغ و ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے اور ہم عصر اردو افسانے پر مشتمل دو شمارے (۱۶، ۱۷) شائع کیے۔ تنقید، شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ سوانح عمری، سفر نامہ، خطوط اور تراجم کے حوالے سے بھی مکالمہ کی ادبی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

معیاری ادب ہر دور کی ضرورت رہا ہے۔ کسی خاص نظریہ، گروہ یا مکتبۂ فکر سے وابستگی ادب کا دائرہ محدود کر دیتی ہے۔ مختلف نظریات، رجحانات تحریکات اور تنظیمیں ادب میں پروان چڑھتی رہیں اور ادب کو متاثر کیا۔ مختلف خیالات و نظریات اگرچہ ادب میں بھی تنوع کا سبب بنتے ہیں مگر صورتحال اس وقت خراب ہوتی ہے جب ادیب یا ادیبوں کا کوئی گروہ کسی خاص نظریے یا فکر کا پابند ہو جائے اور دیگر افکار و نظریات کی نفی کرنے لگ جائے تو ایسی صورتحال میں تخلیق کیا جانے والا ادب تخلیقی نہیں تقلیدی ہو گا جو کہ ادب کی روح کے منافی ہے۔ جن رسائل و جرائد نے ان تقلیدی رجحانات کو اپنایا اور محض کسی مخصوص نظریے یا تحریک سے وابستہ تحریریں شائع کیں وہ ادب کے جمود کا باعث بنے۔ ایسے میں جب مکالمہ منظرِ عام پر آتا ہے تو مدیرِ مکالمہ اس کی اولین اشاعت میں ہی اس کا مقصد قاری پر یوں واضح کرتے ہیں:

> مکالمہ کے اجراء کا ایک اور مقصد ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں مختلف الخیال ادیب ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کا احترام کرتے ہوئے، مختلف فکری اور ادبی مسائل اور موضوعات پر پوری آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ آپس میں مکالمہ کر سکیں۔ اس لیے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ مکالمہ کسی مخصوص مکتبۂ فکر یا دبستان کا علَم بردار یا mouthpiece نہیں بنے گا بلکہ اس کے صفحات پر ہم ہر مکتبۂ فکر اور نقطۂ نظر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی نگارشات کا یکساں طور پر خیر مقدم کریں گے۔[۱۹]

۵۔ مبین مرزا (تعارف):

آغاز سے تاحال مکالمہ کی ادارت مبین مرزا کر رہے ہیں۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ملکی و عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک متحرک اور فعال کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک شاعر، ادیب، نقاد اور مترجم کی حیثیت سے ادبی دنیا میں انہیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی نثری اور منظوم تخلیقات کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ بطور شاعر آپ نے غزل اور نظم ہر دو اصناف میں طبع آزمائی کی۔ بطور افسانہ نگار ان کے دو افسانوی مجموعے 'خوف کے آسمان تلے' اور 'زمینیں اور زمانے' شائع ہو چکے ہیں۔ بطور نقاد منٹو پر ان کی تنقید سعادت حسن منٹو: شخصیت و فن ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ بطور ناشر آپ ایک اشاعتی ادارہ اکادمی بازیافت چلا رہے ہیں جو کہ ۱۹۹۶ء سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ اردو کے اہم ادبی شعراء اور ادبا کی تخلیقات کو شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی جریدے مکالمہ کی اشاعت بھی اسی ادارے سے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملکی و عالمی سطح پر ہونے والی کانفرنسز اور سیمینارز میں شرکت کر چکے ہیں اور کئی عالمی کانفرنسوں میں اپنے مقالے بھی پیش کر چکے ہیں۔

مبین مرزا کی متنوع شخصیت ہر حوالے سے قابلِ توجہ ہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے انہیں رجحان ساز شاعر قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی مبین مرزا کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ان کے بارے میں خاص یہ ہے کہ ان کے خیالات کی گہرائی اور احساسات کا پھیلاؤ، زندگی کے بارے میں ان کے انسانی، علمی اور تہذیبی رویے جو ان کی شاعری میں منعکس ہیں اور وہ ارفع سنجیدگی جو ان کے کلام میں جاری ہے اور مجموعی طور سے ان کے اسلوب کی دلکشی ان کی فکری اور فنی پختگی کی شہادت دیتی ہے۔[۲۰]

بطور افسانہ نگار بھی وہ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ رضی مجتبیٰ مبین مرزا کے افسانوی مجموعے خوف کے آسمان تلے پر یوں رائے دیتے ہیں: "جس دور میں ہم زندہ ہیں اس مجموعے کے افسانے اس دور کے سوفی صد آئینہ دار ہی نہیں بلکہ نباض بھی ہیں۔"[۲۱]

پروفیسر سحر انصاری مبین مرزا کی افسانہ نگاری پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> وہ تجریدی یا فرضی معاشروں کی طرف نگاہِ تخلیق نہیں اٹھاتے ہیں بلکہ اپنی سرزمین، اپنے شہر کے گلی کوچوں میں بکھری ہوئی آہوں اور سسکیوں کو سمیٹتے ہیں۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ گردوپیش صرف آہیں اور سسکیاں ہی ہوں، ان میں وہ زندہ وجود بھی ہیں جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ رفاقت، خلوص، ایثار اور اقدارِ حیات کے

موسموں میں پروان چڑھتے ہیں۔ آدمی کو کھرچ کر دیکھئے تو ایک ہی وجود میں کتنے
تضادات کو محسوس کرنا اور دوسروں تک ایک فن پارے کی صورت میں پہنچا دینا فن
پر دسترس اور دلِ دردمند کے بغیر ممکن نہیں۔ [۲۲]

الغرض مبین مرزا' ادب دوست اور ادب شناس شخصیت ہیں-ان کے اس علمی و ادبی زاویۂ نگاہ نے مکالمہ کو ایک منفرد ادبی جریدہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے-پروفیسر عزیز ابن الحسن نے اکادمی بازیافت سے شائع ہونے والی کتاب 'مجموعۂ جمال پانی پتی' پر تبصرہ کرتے ہوئے مبین مرزا کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے اکادمی بازیافت کے قیام اور مکالمہ کے اجراء کو دو بڑے معرکے کے کام قرار دیا ہے۔ کتاب پر تبصرے کے دوران انہوں نے جہاں مکالمہ میں شائع ہونے والے مواد کے اعتبار سے اسے عصرِ حاضر کا منفرد جریدہ قرار دیا ہے وہیں مکالمہ کے اداریوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اداریے اس جریدے میں اشاعت پذیر ہونے والی تحریروں اور ادبی سرگرمیوں کو ایک خاص رخ میں رکھنے کا سبب بھی ہیں۔

ہر رسالہ اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر اور واضح رجحان رکھتا ہے-اسی طرح مکالمہ بھی ایک واضح ادبی منشور کی عکاسی کرتا ہے-اور آج مکالمہ میں شائع ہونے والے متنوع مواد کی بدولت مکالمہ کو ادبی جرائد میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

کسی رسالے یا جریدے کی ادارتی پالیسی دراصل وہ مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ جریدہ شائع کیا جاتا ہے-اداریوں میں ملکی و قومی مسائل کی پیشکش بھی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ادب پر تنقید کا کام بھی کرتے ہیں-اور ادب کی بدلتی صورتحال کے ترجمان بھی ہوتے ہیں اور یوں یہ عصری صورتحال کے ترجمان اور عصری شعور کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ عصری شعور سے مراد یہ ہے کہ مصنف کے خیالات اس خاص عہد کے اجتماعی شعور کا عکاس ہیں اور اس عہد کے غالب رجحانات کے آئینہ دار ہیں اور مکالمہ کے اداریے اس مقصد کو بہ خوبی پورا کرتے ہیں۔ عصری شعور کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے۔ یہ کسی عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، معاشی اور معاشرتی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ کسی بھی اخبار یا رسالے کے اداریے نا صرف اس کی پالیسی کے مظہر ہوتے ہیں بلکہ اداریہ اس خبار یا رسالے کے پورے حلقۂ قارئین کا ترجمان بھی سمجھا جاتا ہے-اداریہ نویس کے خیالات، تجاویز اور تبصروں کا ملک کی سیاست، ادب اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر گہرا اثر پڑتا ہے-وہ عوامی خواہشات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ قارئین کو فکر و نظر کی روشنی بھی دیتے ہیں۔

مکالمہ کے اجراء سے تاحال اس پرچے کے لیے مدیر مکالمہ مبین مرزا "حرفِ آغاز" کے عنوان سے

اداریہ لکھ رہے ہیں۔ ہر اداریے کو ایک عنوان دیا جاتا ہے۔ ان کے اداریوں نے مکالمہ کو ایک خاص سمت میں رکھنے اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ علم و ادب پر گہری نگاہ کی بدولت مکالمہ کے اداریے نا صرف ادبی حیثیت سے نمایاں مقام کے حامل ہیں بلکہ یہ ادب پر تنقیدی مضامین کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مدیرِ مکالمہ ان اداریوں کے لکھنے کا مقصد ہی یہ بتاتے ہیں کہ وہ ان میں اپنے عہد کے ادبی و فکری، تہذیبی و سماجی، سیاسی و سائنسی مسائل کی نشان دہی کر سکیں تا کہ ان پر گفتگو کی جا سکے اور یوں ان پر کسی رائے یا موقف کا اظہار ہو سکے۔

۶۔مکالمہ کا اشاعتی سفر:

ابتدا سے دسمبر ۲۰۱۸ء تک مکالمہ کے شماروں کی زمانی ترتیب نیز اداریوں کے عنوانات ذیل میں درج ہیں:

شمارہ نمبر	دورانیہ	اداریوں کے عنوانات
۱	(۱۹۹۶ء)	حرفِ آغاز
۲	(دسمبر ۱۹۹۷ء)	حرفِ آغاز
۳	(جون ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء)	ادب اور جدید عہد کی صورتِ حال
۴	(اپریل تا اکتوبر ۱۹۹۹ء)	ادیب، سیاست اور معاشرہ
۵	(نومبر ۱۹۹۹ء تا مئی ۲۰۰۰ء)	ادیب، اقدار اور سماج
۶	(جون تا ستمبر ۲۰۰۰ء)	ادب اور حکومتی سرپرستی
۷	(اکتوبر ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء)	تنقید اور سماج
۸	(جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء)	ہم اگر زندہ ہیں تو
۹	(جولائی تا دسمبر ۲۰۰۲ء)	خوف، بیزاری اور ہمارا ادب
۱۰	(جنوری تا جون ۲۰۰۳ء)	عصری حقائق اور ادب
۱۱	(جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء)	ادب فحاشی اور معاشرہ
۱۲	(جنوری تا جون ۲۰۰۴ء)	ادیب کی معروضیت اور جانب داری
۱۳	(جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵ء)	
۱۴	(جنوری تا جون ۲۰۰۵ء)	نیا زمانہ، ادب کا زوال اور ہم
۱۵	(جولائی ۲۰۰۵ء تا جون ۲۰۰۶ء)	ادب اور حالتِ جنگ

۱۶	(جولائی ۲۰۰۶ء تا دسمبر ۲۰۰۷ء)	ہم عصر اُردو افسانہ۔۔ایک مطالعاتی تناظر
۱۷	(جنوری ۲۰۰۸ء تا جولائی ۲۰۰۹ء)	گزشتہ سے پیوستہ
۱۸	(اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء)	ادب میں وفاداری
۱۹	(اگست ۲۰۱۰ء تا دسمبر ۲۰۱۱ء)	عصری ادب کا اضطراب
۲۰	(جنوری ۲۰۱۲ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء)	ادیب اور قیامِ امن
۲۱	(جنوری ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء)	اکیسویں صدی میں ادب اور قاری کا رشتہ
۲۲	(جولائی ۲۰۱۵ء تا مئی ۲۰۱۶ء)	اکیسویں صدی کے ادیب کی دنیا
۲۳	(جون تا اگست ۲۰۱۶ء)	مفروضہ حقیقت کی دنیا اور ادب
۲۴	(ستمبر ۲۰۱۶ء)	ادب۔۔جانب دار یا غیر جانب دار
۲۵	(اکتوبر ۲۰۱۶ء)	ادیب اور فکرِ آخرت
۲۶	(نومبر ۲۰۱۶ء)	جدید دنیا، روبوٹ اور ادب
۲۷	(دسمبر ۲۰۱۶ء)	ادب اور خراب حالات
۲۸	(جنوری ۲۰۱۷ء)	قومی / سرکاری زبان کا مسئلہ
۲۹	(فروری ۲۰۱۷ء)	ادب اور اصلاحِ احوال
۳۰	(مارچ ۲۰۱۷ء)	ادب میں قومیت اور آفاقیت کا مسئلہ
۳۱	(اپریل ۲۰۱۷ء)	بحران کے دنوں میں ادب
۳۲	(مئی ۲۰۱۷ء)	ہم ادیب شاعر لوگ
۳۳	(جون ۲۰۱۷ء)	گیجٹس کے دور میں ادب
۳۴	(جولائی ۲۰۱۷ء)	ادب میں انفرادیت
۳۵	(اگست ۲۰۱۷ء)	ادیب اور مصلحت
۳۶	(ستمبر ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸ء)	ادب کی سماجیات اور ہمارا عہد
۳۷	(جون ۲۰۱۸ء)	ادب کی سماجیات۔۔۔چند اور پہلو
۳۸	(جولائی ۲۰۱۸ء)	ہمارے عہد میں ادب کا موضوع
۳۹	(اگست ۲۰۱۸ء)	ادب میں خیر و شر

۴۰	(ستمبر ۲۰۱۸ء)	ادب اور کردار
۴۱	(اکتوبر ۲۰۱۸ء)	ادب میں نئی تحریک کا سوال

اگلے ابواب میں مکالمہ کے اداریوں کے جائزے سے اس رسالے کی نظریاتی جہت کا جائزہ لیا جائے گا نیز ان میں عصری موضوعات، عصری قومی و ملکی مسائل و بین الاقوامی مسائل کی پیشکش اور عالمگیریت کے جدید رجحانات کا جائزہ لیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ روشن آراراؤ، مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۹ء)، ص ۱۳۔

۲۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین، اردو کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز ۱۹۹۵ء): ص ۲۹۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۶ء): ص ۱۴۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۶۔ اشرف کمال، اردو ادب کے عصری رجحانات کے فروغ میں مجلہ افکار کراچی کا کردار (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۸ء): ص ۲۰۔

۷۔ ساحل احمد، اردو میں گل دستوں کی روایت (الٰہ آباد: ۱۹۹۸ء): ص ۱۹۔

۸۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص ۳۶۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۷ء)، ص ۲۰۔

۱۱۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص ۵۲۔

۱۲۔ روشن آراراؤ: مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل، ص ۳۱۔

۱۳۔ ڈاکٹر سجاد پرویز، اردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان): ص ۴۶۔

۱۴۔ ڈاکٹر شگفتہ حسین، ماہنامہ ادبِ لطیف کی ادبی خدمات (۱۹۳۵ء تا ۱۹۹۵ء)، (ملتان: شعبہ اردو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء)، صفحہ ۷۶۔

۱۵۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص ۷۲،۷۱۔

۱۶۔ سید عبداللہ "فنون کا پہلا پرچہ" مشمولہ فنون لاہور ش (۱۹۶۳ء): ص ۳۰۷۔

۱۷۔ مبین مرزا، راقمہ سے انٹرویو بذریعہ میل، ۴ فروری ۲۰۲۰ء، شام ۴۲:۷۔

۱۸۔ مبین مرزا، "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ، ش ۱ (جولائی تا ستمبر ۱۹۹۶ء): ص ۱۴۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ڈاکٹر عرش صدیقی، "مبین مرزا کی شاعری" مشمولہ ارتکاز، کراچی ج ۱، ش ۴،۳ (مارچ ۱۹۹۵ء)، ص ۳۷۰۔

۲۱۔ رضی مجتبیٰ، "عہدِ رواں کا ایک مشہور افسانہ نگار" مشمولہ ارتکاز، ش ۲،۱ (جون تا اکتوبر ۲۰۰۷ء)، ص ۳۷۵۔

۲۲۔ سحر انصاری، "مبین مرزا کی افسانہ نگاری" مشمولہ ارتکاز کراچی، ش ۲،۱ (جون تا اکتوبر ۲۰۰۷ء)، ص ۳۸۱۔

باب دوم

مکالمہ کے اداریوں میں ملکی و قومی مسائل کی پیش کش کا جائزہ

باب دوم

مکالمہ کے اداریوں میں ملکی و قومی مسائل کی پیش کش کا جائزہ

ہر رسالہ یا جریدہ اپنا ایک مخصوص مقصدِ اشاعت اور واضح رجحان رکھتا ہے۔ اس کا اپنا ایک ادبی منشور ہوتا ہے جو اس رسالے کی ادارتی پالیسی کہلاتا ہے۔ اخبار یا رسالے کی ادارتی پالیسی وہ خیال یا نظریہ ہے جو اس رسالے یا اخبار کو جاری کرنے کی وجہ بنتا ہے۔ زیرِ تحقیق رسالے کے مدیر اس رسالے کے اجرا کا مقصد ہی عصری ادب کا مطالعہ اور اس کے بارے میں رائے پیش کرنا قرار دیتے ہیں اور اس جریدے کو عصری ادب کی دستاویز بنانے کے متمنی ہیں۔ سنڈے میگزین "جسارت" کو انٹرویو دیتے ہوئے مکالمہ کی ماہانہ اشاعت سے متعلق سوال کے جواب میں مدیر مکالمہ کہتے ہیں کہ:

> بیس بائیس پرچوں کے بعد تقریباً دو سال قبل ہم نے فیصلہ کیا کہ اس پرچے کو باقاعدہ ماہانہ شائع کیا جائے تاکہ ادب کے تازہ مسائل اور عصری صورتحال میں پیدا ہونے والے سوالات سے اپنے تعلق کا اظہار کرے اور ادیبوں کے خیالات اور ردعمل کو سامنے لاسکے۔[1]

اس پالیسی کا اظہار مکالمہ کے اداریوں میں وقتاً فوقتاً دکھائی دیتا رہتا ہے اور کسی رسالے کا اداریہ ہی اس کی پالیسی کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ اداریہ دراصل وہ مختصر مضمون ہوتا ہے جو اخبار یا رسالے کا مدیر لکھتا ہے اور اس کا مقصد اخبار یا رسالے کی پالیسی کے مطابق اخبار یا رسالے کو ایک مخصوص سمت میں رکھنا، قارئین کی رائے ہموار کرنا اور اس پالیسی سے عوام کو ہم آہنگ کرنا ہے۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے اپنی کتاب میں اداریے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> اداریے کے لغوی معنی 'مدیر کی تحریر' یا مدیر کے انداز میں اظہارِ خیال کے ہیں لیکن عرفِ عام میں اس سے وہ مضمون مراد ہوتا ہے جو اخبار یا رسالے کے ادارتی صفحے پر اس اخبار یا رسالے کے نام کی تختی کے نیچے چھپتا ہے، خواہ اسے مدیر نے لکھا ہو یا اداریے کے کسی دوسرے رکن نے یا کسی اور شخص نے۔[2]

مندرجہ بالا تعریفیں ادبی جرائد کے اداریوں پر مکمل طور پر لاگو نہیں ہوتیں کیونکہ اردو میں اداریوں کا آغاز

اخبارات کے اداریوں کے لکھنے سے ہوا۔ یہ کسی بھی ہنگامی موضوع پر مدیر کی ذاتی رائے یا اخبار کی پالیسی کے مطابق تحریر ہوتی ہے۔ اردو اخبارات میں سیاسی، سماجی، مذہبی غرض ہر طرح کے موضوعات پر اداریے لکھے گئے۔

اگرچہ ادبی رسائل و جرائد کے اداریوں کی کوئی واضح تعریف متعین نہیں کی گئی۔ مگر اخبارات کے اداریوں کی جو مختلف تعریفیں بیان ہوئی ہیں ان کے پیش نظر ادبی رسائل کے اداریے ادبی صورت حال کے عکاس، مبصر اور تجزیہ ہوتے ہیں۔ ایک ادبی جریدے کا اداریہ نا صرف اس کی پالیسی کا مظہر ہوتا ہے بلکہ یہ رسالے یا جریدے کے پورے حلقہ قارئین کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ مدیر کا ادب کے حوالے سے کیا نقطہ نظر ہے یہ بھی اداریے سے ہی واضح ہوتا ہے۔ اداریہ دراصل مدیر کی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے اور جریدے یا رسالے کے مزاج کا تعین بھی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اداریہ اس رسالے کی سمت کا تعین بھی کرتا ہے اور ادیبوں کے لیے راہنمائی کا فریضہ بھی سر انجام دیتا ہے۔

ادبی رسائل و جرائد میں لکھے جانے والے اداریے دراصل ادب پر تنقید کا کام بھی کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت ادب پر تنقیدی مضامین کی سی ہوتی ہے جو ادب کی سمت متعین کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں، نئے ادبی مباحث کو جنم دیتے اور نئی تحریکوں، نئے رجحانات کی سمت راہنمائی بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے "اوراق" کے لیے لکھے گئے اداریوں کے مجموعے پہلا ورق کے پیش لفظ میں ڈاکٹر انور سدید اداریوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ادبی پرچے کا اداریہ مکمل مقالہ یا مبسوط مضمون نہیں ہوتا۔ یہ اہم ترین زمانی اور عصری مسئلے کو اشاراتی انداز میں قارئین کے سامنے لاتا اور انھیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔[۳]

ادبی رسائل و جرائد کے اداریوں سے نا صرف اس دور کے مسائل کو جانا جا سکتا ہے بلکہ ان کے مطالعے سے اس عہد کے ادب کے مزاج کو بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے اور یہ مستقبل کے لیے سمت کا کام بھی کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے راغب شکیب لکھتے ہیں کہ:

> ادبی پرچے کا اداریہ نہ صرف مدیر کے نظریات کا نقیب اور پرچے کی حکمتِ عملی کا غماز ہوتا ہے بلکہ یہ متعدد زاویوں سے نئے رجحانات اور نئی تحریکوں کی سمت راہنمائی بھی کرتا ہے۔ ادبی معاشرے میں در آنے والے مصائب کی نشاندہی کرتا ہے اور ادب کے مستقبل کے خطرات سے آشنا کرتا ہے۔[۴]

زیرِ تحقیق ادبی جریدے مکالمہ کے لیے پہلے شمارے سے تا حال اداریے مبین مرزا ہی لکھ رہے ہیں۔ مبین مرزا جو کہ ادب سے حقیقی لگاؤ رکھنے والے اور ادب شناس شخصیت ہیں انھوں نے مکالمہ کے اداریوں میں عصر حاضر کے جن ادبی مباحث و مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے وہ ادب میں ایک بڑے سرمایے کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ ادب اور معاشرہ باہم مربوط اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ معاشرے کا اثر ادب پر ہوتا ہے اور ادب ہر صورت معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اور ایک ادبی جریدہ جو کہ متنوع موضوعات پر مشتمل تنقیدی، تخلیقی و تحقیقی تحریروں کا خوب صورت گلدستہ ہوتا ہے اس میں بیک وقت قاری کو تمام اصنافِ ادب تک رسائی میسر آجاتی ہے۔ چنانچہ ادبی رسائل کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب کو صرف معاشرے کا آئینہ دار ہی نہ بنائے بلکہ معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری بھی اٹھائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ادیب ان تمام مضمرات سے آگاہ ہو، جو معاشرتی برائیوں کا سبب بن رہے ہیں، ان کی نشاندہی بھی ادیب کا فرض ہے۔ ایسی صورت میں تخلیق ہونے والا ادب ہی حقیقی معنوں میں تنقیدِ عصر کا فریضہ سرانجام دے گا۔

ادبی رسالے مکالمہ میں ہمیں ادب کی بدلتی ہوئی صورتحال کی ترجمانی بخوبی ملتی ہے اور ہر حوالے سے عصری شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس موقف کا اظہار جریدے کے دوسرے شمارے کے اداریے میں ہوتا ہے:

> ہر عہد اور معاشرے کا معیاری ادب اس کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ناقد اور مبصر بھی ہوتا ہے جس میں اس کی طرزِ زندگی، اقدار، تہذیب اور اخلاقیات کا نہ صرف یہ کہ اعلیٰ انسانی اقدار کی روشنی میں جائزہ لیتا ہے بلکہ ان معیارات کی روشنی میں اس کی صورتِ حال کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا ہے۔[5]

اگرچہ کسی بھی رسالے یا جریدے کے اداریے کا باقاعدہ اور مبسوط مضمون نہیں ہوتا مگر یہ ادب پر تنقید کے مضمون کی حیثیت بہرحال رکھتا ہے۔ یہ اپنے عہد کے اہم ترین مسائل کو اشاراتی انداز میں قارئین کے سامنے لاتا ہے اور انھیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اداریوں میں کہیں ملکی و قومی مسائل اور بین الاقوامی حالات و واقعات کی روشنی میں خبروں کا اور واقعات کا بھرپور تجزیہ کیا جاتا ہے اور کہیں ان اداریوں کی نوعیت علمی و فکری مضامین کی سی ہوتی ہے۔ ادب میں کون سے نئے رجحانات پروان چڑھ رہے ہیں ان کی نشاندہی بھی اداریوں میں ہوتی ہے۔ لیکن کسی بھی موضوع کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے جو تجزیہ یا تبصرہ کیا جاتا ہے اس میں مدیر اپنی رائے قارئین پر تھوپتا نہیں بلکہ قاری خود اس کی تائید و تردید کا فیصلہ کرتا ہے اور یہی آرا ادیبوں کے لیے بھی راہنمائی کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ ایسے ہی عصری مسائل کی نشاندہی ہمیں مکالمہ کے اداریوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

زیرِ تحریر باب میں جائزہ لیا جائے کہ عصری ملکی و قومی مسائل کے حوالے سے مکالمہ کی ادارتی پالیسی کیا ہے؟ اور کون سے ایسے قومی و ملکی مسائل ہیں جو ادب پر اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتے ہیں؟ دیکھا جائے گا کہ مکالمہ کے اداریوں میں ان مسائل کو کس طرح پیش کیا گیا اور ان مسائل کے حوالے سے مکالمہ کا نقطۂ نظر یا

پالیسی کیا ہے؟

ہم مکالمہ کے اداریوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس صورت میں کئی طرح کے ادبی مباحث و مسائل کا بیان ملتا ہے۔ مدیر کی ادبی بصیرت کبھی ملک میں ادب اور سیاست کے رشتے پر بات کرتی ہے تو کبھی جدید دنیا میں ہونے والی ترقی کے ادب پر اثرات جیسے موضوعات پر بحث ملتی ہے۔ ادب کو کن سماجی و اخلاقی مسائل سے واسطہ پڑتا ہے ان موضوعات پر بھی مدیر کی بے لاگ آراء پڑھنے کو ملتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اداریہ مدیر کی شخصیت کا عکاس اور رسالے کی پالیسی کا ترجمان ہوتا ہے کیونکہ اس کا کام ادب اور ثقافت کو تشکیل دینے میں لکھنے والوں کی درست راہنمائی کرنا اور تخلیق کاروں کے ذہنوں کو اصل سمت دکھانا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اداریہ نویس اداریوں میں علمی و فکری گفتگو سے پڑھنے والوں کے لیے سوچ کے نئے در کھولتا ہے اور کبھی کبھی ایسے موضوع پر اظہارِ خیال کرتا ہے کہ جو عام آدمی کے ذہن میں نہ آیا ہو یا وہ اس موضوع اور مسئلے پر اس گہرائی سے نہ سوچتا ہو۔ یوں مدیر کی رائے' پڑھنے والوں کو علم و ادب کی نئی راہیں دکھاتی ہے جو مختلف ادبی و فکری موضوعات کو زیرِ بحث لا کر قارئین کو ادبی شعور عطا کرتا ہے۔

لہٰذا دوسرے باب میں ہم مکالمہ کے اداریوں میں ملکی و قومی مسائل کو ادبی و فکری، سیاسی و سماجی اور سائنسی منظر نامے کی ذیل میں دیکھنے کی کوشش کریں گے تاکہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی واضح ہو سکے۔

ا۔ مکالمہ کے اداریوں میں ادبی و فکری مسائل کی پیش کش کا جائزہ:

مکالمہ کے اداریوں میں عصرِ حاضر کے ادبی و فکری مسائل کا پورا پورا شعور نظر آتا ہے۔ ان اداریوں میں ادب کو درپیش سماجی و اخلاقی مسائل پر آواز بلند کی گئی۔ اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی ان سماجی و اخلاقی مسائل کے حوالے سے کیا ہے۔ ہم مکالمہ کے اجراء کے وقت کی ادبی صورتِ حال پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

ہر دور میں کسی بھی موضوع کے حوالے سے دو طرح کے نقطۂ نظر کے لوگ موجود ہوتے ہیں جنھیں ہم قنوطی و رجائی میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جب مکالمہ کا اجراء ہوا تو بیسویں صدی اپنے اختتام کی طرف گامزن تھی اور اکیسویں صدی کا سورج طلوع ہونے کو تھا۔ اس دور میں ادب کے حوالے سے جو دو طرح کے نقطۂ نظر کے حامل لوگ نظر آتے ہیں، ان میں ایک طبقہ تو وہ تھا جو معاصر ادبی صورتِ حال کو دیکھ کر قنوطیت کا شکار ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ادب روبہ زوال ہے۔ جیسا کہ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

اس وقت ایک ایسا سناٹا ہے کہ جس میں حرکت و عمل بند سا ہو گیا ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ معاشرے میں انسانی و معاشرتی اقدار، صداقتوں کی تلاش اور زندگی کی معنویت و دریافت کرنے کی کوشش بھی نظر نہیں آتی۔[۵]

جبکہ دوسرے طبقے کے نمائندہ افراد کے ہاں صورتِ حال مختلف ہے۔ وہ رجائیت پسند ہیں اور ادب کی موجودہ صورتِ حال سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ ان دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان مکالمہ کی ادارتی پالیسی قدرے مختلف ہے اور وہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مدیرِ مکالمہ ادب کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں ایک مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ نہ تو آنکھیں بند کر کے رجائیت کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی قنوطی بن کر ادب کے جمود کا رونا روتے ہیں بلکہ وہ حقیقت پسند بن کر حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلے کے اسباب و وجوہات بیان کرتے ہیں۔ اور اپنی علمی و ادبی بصیرت سے اس کا ممکنہ حل بھی بتاتے ہیں۔ مدیرِ مکالمہ کے نزدیک ادب اگرچہ زوال پذیر ہے مگر یہ زوال معیار اور مقدار کی کمی کے باعث ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک عہدِ حاضر میں ادب کی انحطاطی کیفیت سے نکلنے کا واحد راستہ معیاری اور زندہ تخلیقی ادب کی اشاعت ہے۔

مکالمہ کے شمارہ ۶ میں قراۃ العین حیدر کا مضمون "کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے؟" شائع ہوا۔ یہ مضمون عہدِ حاضر میں ادب کی اسی صورتِ حال کے تناظر میں لکھا گیا۔ یہ ایک طویل مضمون ہے جس میں انھوں نے ادب میں زوال کے سوال پر بحث کرتے ہوئے قدرے جذباتی انداز میں ان وجوہات پر روشنی ڈالی ہے جن کے باعث آج کا ادب زوال پذیر اور جمود کا شکار سمجھا جاتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ادیبوں کے اس رویہ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جو یہ سمجھتے ہیں کہ ادب میں جمود کی وجہ مناسب ادبی ماحول اور ساز گار حالات کا نہ ہونا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کے جمود کی وجہ ادیبوں کی سہل پسندی ہے۔ لکھتی ہیں کہ ہم آج سہل پسند ہو چکے ہیں، غور و فکر کرنا نہیں چاہتے اور آنکھیں موند کر ادب کے جمود کا رونا روتے رہتے ہیں۔ وہ ادیبوں اور شاعروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں:

محض اپنے گرد و پیش کا اندازہ لگا کر میں نے محسوس کیا کہ جس طرح ہم اپنے متعلق سنجیدہ نہیں اسی طرح اپنے ادب کے سلسلے میں بھی لاپرواہ ہیں۔ بنیادی حقائق اور مسائل سے بے نیازی اسی ذہنی کاہلی اور بے تعلقی کا نتیجہ ہے جو شاید مایوسی کے بعد پیدا ہوتی ہے لیکن اس مایوسی کے بعد کچھ کرنے کی لگن کیوں نہ ہوئی، اس کا جواب آپ خود دیجیے۔ اس کے ذمہ دار ملک و قوم نہیں آپ خود ہیں۔[۶]

ادیب تو معاشرے کا نبض شناس ہوتا ہے اور عام انسانوں سے قدرے مختلف سوچ رکھتا ہے۔ اس کا کام لکھنا ہے اس بات سے قطع نظر کہ حالات کیسے ہیں؟ اس مضمون میں انھوں نے ادیبوں کو مخاطب کر کے ادب کے زوال

کی مختلف وجوہ بیان کیں اور ادب میں زوال کی وجوہات پر بحث کرتے ہوئے آخر میں اس مسئلے کا ذمہ دار ادیب کو قرار دیا۔ اور اس مسئلے کے حل کے لیے بھی وہ ادیب کو ہی ذمہ داری سونپتی ہیں۔ ادیب کو اس کے مقام سے روشناس کراتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اسٹریوٹائپ کچھ اور سوچ رہا ہے اور آپ کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ اور چوں کہ آپ مختلف طور پر سوچنے کی اہلیت رکھتے ہیں، آپ کے لیے وہ خوف ناک لفظ 'فن کار' استعمال کیا جاتا ہے آپ اس خطاب کو بڑی ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں لیکن اگر آپ واقعی فن کار ہیں تو آپ کی ذمہ داری آپ کے دوسرے بھائی بندوں سے کہیں زیادہ ہے۔ موسیقار، سنگ تراش، مصور اتنے آدمیوں تک نہیں پہنچتے۔ آپ کی کتابیں ہر بک اسٹال پر موجود ہیں۔ آپ کے افسانے کالج کی ہر لڑکی پڑھتی ہے اور ایک سماجی اور اقتصادی طور پر پس ماندہ ملک کے مصنف کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ چوں کہ آپ ایک کم علم، توہم پرست، فاقہ زدہ سیاست کی ماری ہوئی قوم کے لیے لکھیں گے۔''[۵]

قرۃ العین حیدر کے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مکالمہ کی پالیسی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے صفحات میں جن تحریروں نے جگہ پائی وہ حقیقی معنوں میں ادب کہلانے کے لائق ہیں۔

ادب کو زوال سے نکالنے میں کردار ادا کرنے والی واحد شخصیت ادیب ہے۔ ایسے میں ادیب کو اپنی ذمہ داریوں پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ اور معیاری ادب کی تخلیق ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے اور مکالمہ نے اپنی اوّلین اشاعت سے ہی معاصر ادب اور اپنے عہد کے سماجی نظریات میں ربط قائم رکھتے ہوئے معیاری ادب کی تخلیق و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مکالمہ کے شمارہ ۷ (اکتوبر ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء) میں شامل انتظار حسین کا تنقیدی مضمون ''عصری ادب کا مسئلہ'' بھی اس بات سے بحث کرتا ہے کہ عہدِ حاضر میں ادب کے زوال کی وجہ دراصل ادب کی بے قدری ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ادیب اور میڈیا کے کردار پر بحث کی ہے۔ ادب میں زوال کا سوال ہر دور میں اٹھتا رہا ہے۔ چنانچہ مکالمہ کے مباحث میں بھی اس مسئلے پر وقتاً فوقتاً مختلف نقطہ ہائے نظر سے جائزہ لیا جاتا رہا ہے۔ مکالمہ کے شمارہ نمبر ۱۴ میں جو اداریہ شائع ہوا، اس میں ایک بار پھر اس مسئلہ کو موضوعِ بحث بنایا گیا۔ ادبی رجحانات ہر دور میں رو بہ تغیر رہتے ہیں۔ کسی عہد کو ہم ادبی ترقی کے عہد سے موسوم کرتے ہیں تو کسی دور میں ہمیں ادبی سرگرمیاں ماند پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ادب کی جو صورتِ حال دکھائی دیتی ہے،

اس میں کہیں کوئی واضح تحریک یا رجحان دکھائی نہیں دیتا۔ ایسی صورت میں ادب کے پرانے لکھاری جن کا تخلیق سے رشتہ نصف صدی سے زیادہ کا ہو چکا اور جنھوں نے اردو ادب میں مختلف تحریکوں کا مشاہدہ کیا ہے وہ موجودہ صورتِ حال کا جائزہ بہتر طور پر لے سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب حقیقی معنوں میں روبہ زوال ہے۔ ان تجزیہ نگاروں میں حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسی شخصیات شامل ہیں۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> اپنے ادب کو دیکھیے تو اس وقت یہ مہمل بے مقصدیت کا شکار ہے۔ اس کی روح میں کوئی ایسی معنویت نہیں ہے جس سے فرد اور معاشرے کے بنیادی سوالوں کا جواب مل رہا ہو۔ وہ جواب جس سے فرد اور معاشرہ میں شعور پیدا ہوتا ہے۔[9]

مکالمہ کی پالیسی بھی اس بات سے متفق دکھائی نہیں دیتی کہ ادب زوال پذیر ہے مگر بات یہیں تک نہیں رہتی بلکہ ادب کے زوال کی وجوہات کیا ہیں؟ اور اس زوال پر کیوں کر قابو پایا جا سکتا ہے؟ اس پر بھی ہمیں مدیر کی بصیرت افروز گفتگو ملتی ہے۔ مدیر مکالمہ اس اداریے میں لکھتے ہیں کہ نئی دنیا اور نئے عہد نے ادب اور ادبی سرگرمیوں کو متاثر کیا ہے۔ ماضی میں ادب کو جو ماحول میسر تھا وہ اب نہیں۔ گزشتہ صدی کی نسل کا تجربہ عصرِ حاضر کی نسل سے مختلف ہے اور یہی حال نئے زمانے کے لکھنے والوں کا بھی ہے۔ ہر دور نے اپنے لکھنے والوں کو اپنے انداز سے متاثر کیا۔

ادب کی صورتِ حال کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد وہ اس کا حل بھی پیش کرتے ہیں کہ محض ادب کے زوال کا نعرہ لگا کر اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا مسئلے کا حل نہیں بلکہ ایسے ادب کو تخلیق کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری تہذیب و روایات کا پاس دار ہو۔ اور ایسا ادب تخلیق کرنے والوں کی پذیرائی بھی کرنی چاہیے۔ اور مکالمہ نے اس بات کو ثابت بھی کیا اور ہر اس تخلیق کو مکالمہ میں جگہ دی جو تہذیبی روایات و اقدار کا آئینہ دار ہے اور اس سلسلے میں نئی یا پرانی نسل اور نئے یا پرانے لکھنے والوں میں تفریق قائم نہیں کی۔ اکیسویں صدی جوں جوں سالوں کی سیڑھیاں چڑھتی جا رہی ہے۔ زمانے میں مادی ترقی کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی ہے احساسات کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے عالمی طاقتیں دنیا کو بے تہذیب اور اقدار سے عاری کرنے کی کوششوں میں مگن ہیں ایسے حالات میں ادب واقعتاً زوال پذیر دکھائی دیتا ہے بلکہ ادب کی ضرورت بھی ایک سوال بنتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اگست ۲۰۱۶ء کے شمارے میں اس سوال کو ایک پھر موضوع بحث بنایا گیا جب مکالمہ کی اشاعت ماہانہ کی گئی۔

> ادب کی زندگی اور موت کی بابت گزشتہ برسوں میں بہت گفتگو ہوئی ہے اور اب بھی ہو

رہی ہے اور یہ گفتگو ابھی کچھ عرصے تک ہوتی رہے گی۔ تاہم یہ بات کسی دبدھا میں پڑے بغیر ہمیں پورے تیقن کے ساتھ سمجھ لینی چاہیے کہ ادب پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی بیشی ایک الگ معاملہ ہے لیکن ادب ہر حال زندہ رہے گا۔[۱۰]

عہدِ جدید میں ادب سے وابستگی میں کمی کو دور کرنے کے لیے مکالمہ ادیبوں اور شاعروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ سماجی وابستگی قائم رکھتے ہوئے اپنی تہذیب و ثقافت اور اخلاقی اقدار کی بقا کے لیے کام کریں۔ ادیب کا یہی کردار دورِ حاضر کی ضرورت ہے۔

کسی بھی رسالے کے اداریے ہی اس کی پالیسی کے ترجمان ہوتے ہیں اور رسالے کی سمت کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی راہنمائی کا فریضہ بھی سر انجام دیتے ہیں۔ ادیب کی اصلاح اور راہنمائی ہی ادب کی اصلاح ہے۔ عہدِ حاضر کا ایک المیہ یہ ہے کہ ظاہری مادی ترقی کے باوجود اخلاقی گراوٹ اور زوال بڑھتا جارہا ہے اور یہ شکست و ریخت معاشرے کے ہر شعبے میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں ادیب بھی اس سے بچ نہیں سکا اور ادیب کی یہی اخلاقی شکست ادب کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ادیب کی اصلاح اور نگرانی کرتے ہوئے مبین مرزا لکھتے ہیں:

> ہماری ذمہ داری اب یہ ہے کہ ہم اس محاذ (ادب) پر مامور افراد میں سے یہ دیکھیں کہ کون کون اپنے کام سے سنجیدہ اور مخلص ہے۔ گویا ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ اہلِ ادب میں وہ کون لوگ ہیں جو ادب کو بجائے خود مقصد سمجھتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جن کے نزدیک ادب محض غیر ادبی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لیے کہ غیر ادبی مقاصد رکھنے والے لوگ ادب کے نام پر اپنی مطلب بر آوری کے لیے غیر مہذبانہ، غیر علمی حتیٰ کہ غیر انسانی رویہ اختیار کرنے اور اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے تک سے گریز نہیں کرتے۔ اگر ہم انہیں شناخت کر لیں تو ادب اور غیر ادب میں امتیاز از خود قائم ہو جائے گا۔[۱۱]

ادیبوں کے اسی رویے کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اکتوبر ۲۰۱۶ء کے شمارے میں ''ادب و فکرِ آخرت'' کے عنوان سے ایک اداریہ سپردِ قلم کیا گیا جس میں مختلف ادیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کو واضح کیا گیا کہ کس قسم کا ادبی رویہ ایک ادیب کو حیاتِ دوام عطا کرتا ہے؟ ادیب معاشرے کا ایسا فرد ہوتا ہے کہ اس کا فن ہی اس کی یادگار ہوتا ہے اور اس کی عظمت و تکریم کا باعث بنتا ہے۔ مگر فن کے راستے میں شہرتِ دنیا اور جاہ و منصب کی خواہش کا آڑے آنا فن کی موت کا باعث بنتا ہے۔ وہ ادیب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

> وہ سارے ادیب جنھوں نے زندہ ادب چھوڑا ہے اس مرحلے سے سرخ رو گزرے ہیں۔ یہ سرخ روئی ادیب کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کا کام دنیا کی باقی ساری چیزوں سے

بڑھ کر اسے عزیز ہوتا ہے۔ سارے جہاں کی دولت و آسائش پر تقدم رکھتا ہے۔[۱۲]

لہٰذا مکالمہ کے صفحات پر جن تحریروں نے جگہ پائی وہ حقیقی معنوں میں ادب کہلانے کے لائق ہیں اور غیر ادب سے ان کا کچھ واسطہ نہیں۔

ادیبوں کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے مکالمہ کے شمارہ ۴ کے اداریے میں کچھ بنیادی سوالات اٹھائے گئے مثلاً؛ ادب کا مقام کیا ہے؟ کیا ادب صرف معاشرتی حقائق کے بیان کا کام ہے؟ اس حوالے سے ادیب کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ادب کا مقام و مرتبہ یہ نہیں کہ وہ خبر رسانی کرے اور رائے عامہ کو کسی مخصوص نقطۂ نظر کے تحت ہموار کرے۔ اگر ادب یہ فریضہ سر انجام دے رہا ہے تو محض معاشرتی حقائق بیان کر رہا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ادب معاشرے سے کٹ کر تخلیق ہو سکتا ہے۔ ادب دراصل ان دو انتہاؤں کے درمیان کی شے ہے۔ ادب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جمیل جالبی یوں دیتے ہیں:

> ادب زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے سچائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے گویا ادب زندگی کا اور اس زندگی کی سچائیوں کا اظہار کرتا ہے۔[۱۳]

ادب نہ تو معاشرے سے کٹ کر تخلیق ہو سکتا ہے اور نہ ہی ماضی و مستقبل کو نظر انداز کر کے لکھا جاتا ہے۔ قوموں کے تاریخی اور نظریاتی مباحث بہت اہم ہوتے ہیں کیونکہ یہی وہ قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں جو موجودہ زمانے کے مسائل (سیاسی، سماجی و ادبی) کے حل کے لیے شعور اور بصیرت عطا کرتے ہیں۔

> ادب اپنے گرد و پیش کی حقیقتوں سے یہ ربط ضبط نہیں رکھتا بلکہ اس کی اپنی تاریخ و تقدیر (ماضی و مستقبل) سے بھی گہری وابستگی ہوتی ہے۔[۱۴]

تاریخی واقعات اور نظریاتی مباحث کے بیان میں ایک ادیب کا کردار کیا ہونا چاہیے اور تاریخ کے واقعات کے بیان میں ایک ادیب کا دائرہ کار کیا ہے؟ ان سوالات اور ان کا جواب بھی ہمیں مکالمہ کے شمارہ ۴ کے اداریے میں نظر آتا ہے۔ عصرِ حاضر میں ادب کا مسئلہ یہ ہے کہ ادیب جذباتیت کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ کہیں وہ جانب دار ہو کے کسی مخصوص نظریاتی بندش میں جکڑا ہوا ہے اور اس کا اظہار اس کی تخلیق میں بھی نظر آتا ہے اور کہیں وہ محض صحافتی نمائندہ بن کر ابلاغی رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ یہ دونوں صورتیں ادب کے دائرہ کار میں نہیں آتیں اور مکالمہ کی ادارتی پالیسی یہ ہے کہ اس کی تحریریں ادب کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے پیش کی جائیں۔ مکالمہ میں ادب کا دائرہ کار کچھ یوں بیان ہوتا ہے:

> ادب اپنے معاشرے اور تہذیب کی تشکیل و تعمیر کے عمل میں کردار ضرور ادا کرتا ہے لیکن اس سے اصلاحِ معاشرہ کی تحریکوں یا آئینی اصلاحالات کی سی کارگزاری کا مطالبہ

نہیں کیا جا سکتا اور نا ہی اس سے نظریاتی بار برداری کا کام لیا جا سکتا ہے۔[۱۵]

جس طرح ہر شعبۂ زندگی ترقی کے لیے سہولیات و مراعات کا خواہاں ہوتا ہے ایسے ہی ادبی شعبے کی ترقی و ترویج کے لیے بھی سہولیات درکار ہوتی ہیں۔ دورِ حاضر میں ادب کو درپیش مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ادب کی ترقی و ترویج کے لیے سہولیات کا شدید فقدان ہے۔ قومی و ملکی سطح پر ادب کے فروغ کے لیے کیے جانے والے اقدامات نا ہونے کے برابر ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی غیر یقینی صورتِ حال محض تفریح اور پروپیگنڈے کا کام کرتی ہے۔ ملک میں کسی بھی سطح پر ادبی سرگرمیاں مفقود ہیں۔ ادب کے فروغ کے لیے نہ انفرادی سطح پر کوئی اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں اور نہ ہی سرکاری ادارے اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ادیب پر دوہری ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اسے اپنے مقام و مرتبہ کو سمجھنا ہو گا۔ اسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مدیرِ مکالمہ ادیب پر یہ ذمہ داری ڈالتے ہیں کہ انھیں آگے بڑھ کر کسی بھی قسم کی گروہ بندی اور تعصب سے بالاتر رہتے ہوئے معیاری ادب کی تخلیق کرنی ہو گی۔ ادیب کو اپنے قلم کی طاقت کو سمجھنا ہو گا اور اسے استعمال کرتے ہوئے معاشرے میں ادب کے مقام و مرتبے کو از سرِ نو زندہ کرنا ہو گا۔

ادیب، اقدار اور سماج کے حوالے سے اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مکالمہ کے شمارہ ۵ میں لکھے گئے اداریے میں ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ قومی سطح پر ہمارے ہاں ادیب کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ ادب نے ہر دور میں معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور ادیب میں اتنی طاقت ہمیشہ سے رہی ہے کہ وہ اپنی تحریر کی طاقت کو منوا سکے۔ لیکن آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ یہ بات اب قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ ماضی میں ادیب و شاعر کا جو مقام اور مرتبہ تھا وہ حال سے قدرے مختلف ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب شعرا و ادباء کو معاشرے کا معزز ترین فرد سمجھا جاتا تھا اور افرادِ معاشرہ بالواسطہ یا بلا واسطہ اس سے متاثر ہوتے تھے لیکن جب ہم حال پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ادیب معاشرے کا پسا ہوا معاشی بوجھ تلے دبا ہوا اور کسی بھی قسم کی سہولیات و مراعات سے محروم شخص نظر آتا ہے۔

مکالمہ کی پالیسی و مقصد معاشرے میں ادیب کو اس کا کھویا ہوا وقار دلانا اور اس کا مقام و مرتبہ بحال کرنا ہے۔ مگر اس مسئلے کے اسباب پر غور کرنے کے بعد ادارہ اس کی وجہ کچھ یوں بیان کرتا ہے کہ دراصل ادیب خود اپنے اصل مقصد سے جو کہ معیاری ادب کی تخلیق ہے، دُور ہو گیا ہے۔ کسی ادیب میں کام کی سچی لگن، جستجو، محنت اور اپنے کام کی بڑائی کا احساس وہ عوامل ہیں جو اس کی تخلیق کو اتنی طاقت دے سکتے ہیں کہ وہ معاشرے میں کوئی خاطر خواہ کردار ادا کر سکے۔ مگر مقامِ افسوس یہ ہے کہ دورِ حاضر کا ادیب اپنے فن کی بلندی سے نا آشنا ہے، وہ خود کو کم تر اور دنیا

کو ایک اعلیٰ شے سمجھنے لگا ہے۔ دیکھا جائے تو اس رویے کے پیچھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادیب احساسِ کمتری کا شکار ہے، وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر ہی ادب کی بے قدری کا رونا بھی روتا ہے اور کبھی کبھی معاشرے کی بے توجہی پر شکایت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل یہ لوگ ادیبوں کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو مادیت پرستی کا شکار ہیں اور ادب کے مقام و مرتبے اور اس کی اثر پذیری کی طاقت سے غافل ہیں۔ ادب کی ایسی صورتحال اور ادیب کے ایسے رویے کو احسن سلیم نے کچھ یوں واضح کیا ہے:

> ادیب اور شاعر اپنے ذاتی مفادات کے تحت اتنے مختلف متضاد اور باہم متصادم حلقوں میں بٹ چکے ہیں کہ مجموعی طور پر تخلیقی کثرت کے باوجود ٹرین ایک ہی پلیٹ فارم پر ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ زندگی سے آئیڈیالوجی تھیوری یا ڈسکورس کا رول غائب ہوتا جا رہا ہے۔[۱۶]

عہدِ حاضر کا ادیب مضطرب و بے چین دکھائی دیتا ہے۔ مکالمہ کے شمارہ ۱۹ کا اداریہ اس مسئلے پر بحث کرتا ہے جس کا عنوان ''عصری ادب کا اضطراب'' ہے۔ اسی اداریے میں مدیر مکالمہ نے یہ بیان دیا کہ عصرِ حاضر میں ادب پر اضطراب کا موسم ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس اضطراب کو واضح بھی کیا۔ ماضی اور حال میں اضطراب کی کیفیات کا جائزہ لے کر کہتے ہیں کہ اضطراب، بے چینی، تجسس تو ہمیشہ سے تخلیق کے لیے تحریک کا کام دیتے رہے ہیں جس کی مثال ہمیں ماضی کے ادب سے بخوبی ملتی ہے۔ دنیا میں ہمیشہ اعلیٰ تخلیق کردہ ادب انتشار کے ادوار میں ہی لکھا گیا۔ اضطراب کی ایک قسم شخصی اضطراب بھی ہے جو انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور پھر یہی سوچ اس کو تحریک دیتی ہے کہ وہ ان خیالات کو احاطۂ تحریر میں لے آئے اور یوں یہ تحریک تخلیق میں ڈھل جاتی ہے لیکن عصری ادب کا مسئلہ یہ ہے کہ آج ہمارے ادیبوں کے ہاں پایا جانے والا اضطراب صحت بخش نہیں جو ادب کو فائدہ پہنچائے اور ادیب کو تخلیق کے لیے تحریک دے۔ مبین مرزا کے پیشِ نظر یہ کیفیت کچھ یوں دکھائی دیتی ہے:

> ہمارے یہاں اس وقت جس اضطراب کا اظہار عصری ادب کے تناظر میں پایا جاتا ہے وہ کوئی تخلیقی یا فکری کیفیت کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں خود اپنی ہی شخصیت کی اسیری کارفرما ہے۔[۱۷]

گویا ادیب کا رویہ ایسا ہے کہ وہ بیرونی اثرات سے مغلوب دکھائی دیتا ہے اور اپنے فن کی بلندی سے ناآشنا ہے وہ دنیاوی آسائشات کا حصول بھی چاہتا ہے اور شہرت کا تمنائی بھی ہے۔ جمیل جالبی ادیب کے اس رویے کو کچھ ایسے بیان کرتے ہیں:

> ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اور ادیب تخلیق کے کرب میں مبتلا رہنے کی

بجائے آسائش کے لطف کی تلاش میں دن رات سرگرداں ہے۔[۱۸]

ادیب معاشرے کے دیگر افراد کی نسبت حساس اور زیادہ باشعور ہوتا ہے۔ وہ دیگر افراد کی طرح فقط مسائل کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ ان کا مکمل ادراک کرتے ہوئے تخلیقی عمل کو بروئے کار لا کر اس شعور کو دوسروں تک منتقل بھی کرتا ہے اور یہی اس کے فن کا مقام و مرتبہ ہے جس سے عصرِ حاضر کا ادیب غافل ہو چکا ہے۔ یہاں مبین مرزا خود کو بطورِ ادیب پیش کرتے ہوئے تنقید کرتے ہیں اور اس رویے کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ہم اپنے معاشرے سے بالکل لاتعلق ہو گئے ہیں اس لیے کہ ہمارا سارا دھیان خود اپنی ذات پر مرکوز ہو گیا ہے۔ ہمارا کام اپنی تہذیب اور معاشرے کو بنانا ہے لیکن ہم خود کو بنانے میں مصروف ہو گئے ہیں۔[۱۹]

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ادیب کے اس رویے کی وجوہات اور محرکات کیا ہیں؟ لہٰذا جب ادیب اور سماج کے رشتے پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سارا قصور ادیب کا نہیں بلکہ معاشرہ اس جرم میں برابر کا شریک ہے۔ ادیب بھی اس معاشرے کا فرد ہے اور جہاں ایک طرف وہ معاشرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہیں معاشرے سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس کی بھی معاشی ضروریات و خواہشات ہوتی ہیں۔ مگر ہم بحیثیت قوم اس قدر اخلاقی زوال کا شکار ہو چکے ہیں کہ ہم ادبی خدمت کو کسی کھاتے میں شمار نہیں کرتے اور ادیب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ معاشی مطالبات کیے بغیر ادب کی خدمت میں لگا رہے۔ مگر اصل ظلم جو ادیب کے ساتھ کیا گیا وہ یہ ہے کہ اسے اس خوشی سے بھی محروم کر دیا گیا کہ وہ کوئی بڑا کام کر رہا ہے۔ لہٰذا اگر ادیب مادی دوڑ میں شامل ہو کر اپنے مقام و مرتبے سے غافل ہوا ہے تو اس کی وجہ یقیناً معاشرے میں ادیب کو دی جانے والی عزت و مراعات کی کمی ہے اور یہ دورِ حاضر میں ادب کے زوال کی وجہ ہے۔ مکالمہ کی ادارتی پالیسی اس مسئلے کے متعلق یہ رہی ہے کہ اس نے غیر جانب دار رہتے ہوئے معاشرے اور ادب دونوں کے رویوں پر غور کیا اور اس نظریے کو غلط ثابت کیا کہ ادب میں جمود کی وجہ صرف ادیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمہ میں ہر مکتبۂ فکر کے حامل اور ہر طرح کے ادباء و شعراء اور تخلیق کاروں کو جگہ دی جاتی ہے جو ادب کے مقام و مرتبے پر پورا اُترتے ہیں۔

ادیب اپنی زندگی سے، کائنات سے اور اردگرد معاشرے سے شعور حاصل کرتا ہے اور پھر اپنی گہری بصیرت سے اسے تخلیق میں ڈھال دیتا ہے مگر موجودہ دور کا المیہ یہ ہے کہ ہر انسان خواہ وہ کسی بھی معاشرتی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اپنے اردگرد سے بیگانہ نظر آتا ہے اور محض اپنی ذات کے خول میں گم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم دکھائی دیتا ہے۔ مدیرِ مکالمہ اس بات کی وجہ انسان کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی راہ میں درپیش رکاوٹوں اور

خواہشات کی عدم تکمیل کی الجھن قرار دیتے ہیں اور اس سب میں فرد ایک دوسرے سے لاتعلق، بیگانہ اور وقتی سکون کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔

> ہمارے یہاں جبر حیات نے آدمی کو اس کے عمل اور امکان سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس جبر کی پیدا کردہ بیگانگی کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آج آدمی کے لیے اپنی روح کے تقاضوں کی طرف توجہ کرنا تو کجا وہ اب محض وجود کے مطالبات کی تکمیل کی لذت تک سے ناآشنا ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے لوازم کی مار اسے کچھ سوچنے ہی نہیں دے رہی۔[20]

سوچ کا یہ جمود ادب کے جمود کا باعث بنتا ہے۔ ادب کے اسی مسئلے کو جمیل جالبی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> اس وقت جو کچھ بے ترتیبی اور انتشار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ہم نہ شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں اور نہ شدت کے ساتھ سوچ سکتے ہیں۔ ہم احساسِ کمتری کے مردے کو اپنے سینے سے چمٹائے پھرتے ہیں۔ تہذیبی صحت یا بیماری کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ذات کی اتھاہ گہرائیوں اور احکامات کو بھلا بیٹھے ہیں جو دراصل تخلیق کے سلسلے میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔[21]

مکالمہ کی ادارتی پالیسی اس حوالے سے یہ ہے کہ ادیب ہی اس صورتِ حال کا بہتر ادراک کر سکتا ہے ایسی صورتِ حال میں اگر ادیب بھی اسی معاشرتی دھارے کا حصہ بن جائے گا تو ادب کی سرپرستی کون کرے گا؟ لہٰذا ایک ادیب کا فرض ہے کہ وہ اس گروہ میں الگ شناخت قائم کرے اور اپنے ادب کے ذریعے آدمی کو شعور و احساس کی دنیا میں واپس لائے۔

کسی بھی رسالے یا جریدے کے لیے مواد کی فراہمی ادیب کی ذمہ داری ہے اور ادارہ کس قسم کا ادب شائع کرے گا، یہ اس کی پالیسی پر منحصر ہے۔ کسی رسالے کی ادارتی پالیسی ادیب کے لیے راہنمائی کا کام سرانجام دیتی ہے اور مکالمہ نے یہ ذمہ داری بخوبی نبھائی ہے۔ ادب و فکر کے میدان میں ادیب ایک اہم کردار ہے جس پر ادب کی عمارت استوار ہوتی ہے لہٰذا ادیب کی ذات مختلف پہلوؤں سے ہمیشہ بحث کا مرکز رہی ہے اور اس طرح ادیب کی جانب داری اور غیر جانب داری کا سوال بھی اکثر و بیشتر موضوعِ بحث رہا ہے۔ اسی سوال کو مکالمہ نے بھی اٹھایا اور نہایت عمدگی سے اس کا تجزیہ کر کے ادب کا مقام و مرتبہ واضح کیا ہے۔

یہ تو حقیقت ہے کہ ادیب کے خیالات اس کے گردوپیش کے حالات و واقعات کا ردعمل ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے اسے الفاظ میں ڈھال دیتا ہے مگر اس کا رتبہ محض ایک واقع نگار کا سا نہیں ہوتا۔ ادیب کا مقام یہ ہے کہ وہ

معروضی نقطۂ نگاہ سے حالات و واقعات کا جائزہ لے اور اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرے اور وہ بات کرے جس کو اس کا ضمیر درست مانے۔ اس حوالے سے مدیر مکالمہ لکھتے ہیں:

> رہی ادب کی منصبی معروضیت تو اس سے مراد ہے اشیاء، مسائل اور حقائق کی طرف ایک ایسا رویہ اختیار کرنا جو ذاتی پسند یا ناپسند سے بالاتر ہو، یعنی ایک ایسا اصولی موقف جس پر انفرادی عصبیت اثر انداز نہ ہو۔ گویا جانب داری اگر ضمیر کی آواز پر اختیار کی گئی ہو تو ادیب کی معروضیت معرضِ تشکیک میں نہیں آتی۔ [۲۲]

معاشرے میں سماجی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی انقلابات و تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور جہاں دیگر شعبۂ زندگی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اسی طرح ادب بھی اس سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں رد عمل ضرور پیش کرتا ہے اور اس رد عمل میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں مختلف ادیبوں کی مختلف آراء و نقطہ نظر ہو سکتے ہیں اور یہی آزادی اظہارِ رائے کا حسن ہے مگر اس معاملے میں ایک اصول بہر حال ہر ایک کے لیے کار فرما ہو گا جسے مکالمہ کے اداریوں میں نے واضح کیا گیا ہے:

> ظلم چاہے کسی پر بھی ہو اور جو بھی کرے، ادیب اس کے خلاف اپنا رد عمل ریکارڈ کراتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ظلم کرنے والا کس نظریے یا عقیدے اور آئیڈیالوجی سے تعلق لکھتا ہے اور مظلوم کا تعلق کس سے ہے۔ وہ تو انسانوں کے استحصال اور انسانیت کی تذلیل کے خلاف اجتماع کرتا ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ادیب خود کسی نظریے کا علم بردار یا کسی فلسفے کا پرچارک نہ ہو۔ [۲۳]

ادیب بھی اسی معاشرے کا فرد ہے جس معاشرے میں دیگر انسان بستے ہیں۔ وہ بھی معاشرے کا حصہ ہے، پسند ناپسند تو انسان کی جبلت میں شامل ہے اسی طرح نظریاتی وابستگی بھی انسان کی ذاتی شے ہے۔ مگر ادیب کی وفاداری اور جانب داری ادب میں ایک اہم سوال ہے اور مکالمہ کے اداریوں میں اس سوال کو بار بار اٹھایا گیا جس سے اس نازک مسئلے کی بابت مکالمہ کی ادارتی پالیسی بھی بخوبی واضح ہوتی ہے۔ جدید عہد نے جو تبدیلیاں انسانی زندگی میں پیدا کیں ان میں سب سے بڑی تبدیلی تہذیبی شناخت کا خاتمہ ہے اور ایسی صورتِ حال کہ جہاں دنیا کی تمام تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اپنی شناخت کھو رہی ہیں کچھ خوش آئند نہیں۔ جدید دنیا کا یہ نظریہ کہ ادب انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اور زمان و مکان سے ماورا ہوتا ہے مکالمہ کے نزدیک درست نہیں۔ اس حوالے سے مبین مرزا لکھتے ہیں:

> ادب حقیقت سے ماورا نہیں ہو سکتا اور کوئی حقیقت اپنے عصری سماجی اور تہذیبی تناظر

سے لاتعلق نہیں ہو سکتی۔ حقیقت انفرادی ہو یا اجتماعی اس کی معنویت کا تعین زمانی و مکانی حوالوں کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ادیب اپنے زمانے سے لاتعلق ہو سکتا ہے اور نہ ہی اپنی زمین سے۔[۲۴]

ادیب کی جانب داری و غیر جانب دار کے اسی سوال کو ستمبر ۲۰۱۶ء کے شمارے میں ایک بار پھر اٹھایا گیا جس میں ادب میں غیر جانب داری اور معروضیت کے مطالبے کو مغربی خیالات و افکار کی دین قرار دیا گیا کہ جس پر ہم نے بلا سوچے سمجھے اور چھان پھٹک کیے عمل شروع کر دیا۔ چنانچہ دورِ حاضر میں ادب میں معروضیت سے یہ مراد لیا جانے لگا کہ ادب سماج اور عہد سے لاتعلق ہے۔ مکالمہ نے اس مسئلے کی نشاندہی کی اور ان تمام لوگوں کو جو ادب کی معروضیت کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ سوچنے پر اکسایا کہ فکری وابستگی معاشرے، عہد اور سماج سے ہی ملتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> وہ ادب جسے ہم سب طرح کی سرحدوں سے ماورا اور آفاقیت کا علم بردار سمجھتے ہیں وہ اپنے اوّلین تجزیہ میں سارے معانی اور تمام انسانی اقدار کا اظہار اپنے سماج اور اپنی تہذیب کے تناظر میں کرتا ہے۔[۲۵]

مدیرِ مکالمہ نے اس بات کو بھی واضح کیا کہ معاشرے سے وابستگی کا مقصد یہ ہر گز نہیں کہ ادب کو ایک انقلابی عامل کے طور پر لیا جائے۔ عہدِ حاضر میں جہاں لوگوں میں ادب سے دلچسپی کم ہوئی ہے تو کچھ لوگوں کے خیال میں اس کا ذمہ دار بھی ادب ہے اور وہ یہ گلہ کرتے ہیں کہ ادب اس لیے عدم دلچسپی کا باعث بن رہا ہے کیونکہ وہ معاشرے میں کوئی انقلابی کردار ادا نہیں کر رہا۔ چنانچہ مدیرِ مکالمہ نے اپنی گہری علمی و فکری بصیرت سے قارئین کی توجہ موجودہ دور کے فکری مسائل کی طرف دلائی ہے اور وقتاً فوقتاً ادب کے مقام و مرتبے کو واضح کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے "ادب اور اصلاحِ احوال" کے نام سے اداریہ لکھا جس میں معاشرے میں ادب کا دائرہ کار اور فریضہ واضح کیا۔ انھوں نے بتایا کہ عصرِ حاضر میں لوگوں میں سے ادب سے لگاؤ اور دلچسپی کم ضرور ہوئی اور جس کے اسباب کا کھوج لگانے پر کچھ مفکرین اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ آج کے دور میں ادب اپنا فریضہ درست طور پر سر انجام نہیں دے رہا۔ چنانچہ زیرِ بحث اداریے میں انھوں نے ادب کا مقام و مرتبہ بتایا کہ ادب افادیت یا کسی خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ تہذیب کا صورت گر ہوتا ہے۔ کسی بھی قسم کے انقلاب کی خواہش ایک خاص مقصد ہے اور اس کا واحد ذریعہ ادب نہیں ہے۔ زیرِ بحث اداریے میں مدیر نے یہ واضح کیا ہے کہ جو لوگ ادب سے انقلابی کردار کرنے کے خواہاں ہیں وہ ادب کے مقام و مرتبے سے ناواقف ہیں۔ وہ یہ نقطہ بیان کرتے ہیں کہ کسی خاص مقصد کو مدِ نظر رکھے بغیر تخلیق ہونے والا ادب بھی اپنا اثر رکھتا ہے اور وہی ادب دراصل معاشرے کا حقیقی چہرہ

ہوتا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں کو کسی خاص مقصد کے تحت ڈھالنا، انقلاب کی خواہش، ذہن سازی یہ سب ادب کا دائرہ کار نہیں بلکہ یہ تو ہماری صحافت کا میدان ہے۔

اس نقطۂ نظر کے بیان کے بعد انہوں نے قارئین کی جانب سے ایک ممکنہ سوال کو ذہن میں رکھتے ہوئے خود ہی اس کا جواب بھی دیا کہ جو لوگ ادب سے انقلابی کردار کے متمنی ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں اور اس بات کا جواز پیش کرتے ہوئے وہ تحریک سرسید کی مثال دیتے ہیں کہ انہوں نے بھی تو ادب کو معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا، تو آج ایسا کیوں ممکن نہیں؟ چنانچہ اس سوال کا جواب وہ یوں دیتے ہیں کہ سرسید کی تحریک ادبی تحریک نہیں بلکہ علمی تحریک تھی اور اپنی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے ادب کو بطور وسیلہ استعمال کیا۔ سرسید تو رجحان سازی کر کے معاشرتی اصلاح کے ذریعے تہذیبی بقا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دیگر ممکنہ وسائل کے استعمال کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی اصلاحِ معاشرہ کے لیے وسیلہ بنایا اور اس ساری گفتگو کے اختتام پر وہ نکتہ بیان کیا کہ قاری کے سامنے ادب کا مقام بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ انہوں نے تحریکِ سرسید کی کامیابی کا سبب ان کی مقصدیت سے لگن اور وابستگی بتائی۔ چنانچہ اس صورتِ حال کو جب عہدِ حاضر پر منتج کر کے دیکھتے ہیں تو وہ آج کے دور میں قاری کی عدم دلچسپی، ادب کا معاشرتی رجحانات کی تبدیلی میں صفر کردار، اور ادب اور معاشرے کے کمزور پڑتے رشتے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آج کا ادیب کسی مرکزی طاقت و قوت سے محروم اور ادب کو اپنا مقصدِ حیات نہ سمجھنے کی وجہ سے کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ انہوں نے عصرِ حاضر کے ادیب کا ایک یہ رویہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ ادب کو اپنا مقصد نہیں سمجھتا بلکہ راستہ سمجھتا ہے۔ اس مسئلے کی نشاندہی وہ یوں کرتے ہیں:

> آج اگر ہمارا ادب اور ادیب اپنے معاشرے میں ایسا کوئی موثر کردار ادا نہیں کر پا رہے تو اس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ وہ اکثریتی دائرے میں اس مرکزی قوت سے عاری ہیں جو ادیب کے حرفِ سادہ کو آتش و آہن کی صلابت عطا کرتی ہے اور پھر کردار کی قوت بھی تو ناپید ہے۔[۲۶]

مکالمہ نے ان مباحث کے ذریعے ہر بار اپنی ادارتی پالیسی کو دہرایا ہے کہ وہ مکالمہ کو اپنے عہد کی نمائندہ دستاویز بنانے کی متمنی ہیں کہ جس میں ہمارے عہد کی روح اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ بولتی ہوئی سنائی دے۔ عہدِ جدید میں ادب اور ادیب کے کیا رجحانات ہیں، اور ادب کو درپیش مسائل کے بارے میں اپنی گہری علمی و فکری بصیرت سے خوب روشنی ڈالی۔ اور ادیبوں اور شاعروں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنے عہد کی تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی بقا کے لیے کام کریں اور اس مقصد کے لیے مکالمہ کی صورت میں ایک پلیٹ فارم دے دیا۔ مدیرِ

مکالمہ نے مکالمہ کے اداریوں میں ایسے علمی و فکری مباحث کو اٹھایا ہے کہ جن پر سوچ بچار اور غور و فکر وقت کا شدید تقاضا ہے۔ انہوں نے ادب کے ان مسائل کی طرف نشاندہی کی اور پھر اپنی گہری بصیرت سے ان مسائل کا ممکنہ حل بھی قاری کے سامنے پیش کیا۔ ادب کی ترویج و ترقی میں کردار ادا کرنے والی مرکزی شخصیت ادیب کی اصلاح بھی اپنے ذمے لی اور دلائل و جواز پیش کر کے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

۲۔ مکالمہ کے اداریوں میں سیاسی و سماجی مسائل کی پیش کش کا جائزہ:

ادب اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ادب کے بغیر معاشرہ اور معاشرے کے بغیر ادب کا وجود ممکن نہیں۔ انسان معاشرتی حیوان ہے اور کسی بھی معاشرے میں رہتے ہوئے وہ اپنے جیسے دیگر انسانوں کے ساتھ باہم میل جول رکھتا ہے۔ اس میل جول میں جذبات و احساسات کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے اور جب وہ ان جذبات و احساسات اور خیالات کو الفاظ کے روپ میں ڈھال دیتا ہے تو وہ ادب کہلاتا ہے۔

گویا ادب معاشرے کے جذبات و احساسات کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے۔ معاشرے کی بقاو سلامتی کے لیے کئی شعبہ جات مل کر کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک شعبہ سیاست بھی ہے۔ سیاست معاشرے کا ایک اہم اور پُر اثر شعبہ ہے اور تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ سیاست نے ہمیشہ معاشرے کو، ہمارے ادب کو براہ راست متاثر کیا ہے چنانچہ ادب، سماج اور سیاست آپس میں باہم مربوط ہیں۔ ادب اور سیاست دونوں انسانی معاشرتی زندگی کے اہم پہلو ہیں۔ ادب کی بنیاد بھی معاشرے سے ہے اور سیاست کی بنیاد بھی معاشرے پر قائم ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب معاشرے کا عکاس ہے اور اس کی تلخ حقیقتوں کو آشکار کرتا ہے تو اس میں معاشرے کے تمام شعبہ جات آ جاتے ہیں۔ چاہے وہ سیاست ہو یا معیشت، تہذیب ہو یا معاشرت، سیاست اور ادب کا گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست ہمیشہ سے ادب کا اہم موضوع رہی ہے اردو ادب میں ہمیشہ سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں سیاست کے موضوعات اور مسائل کو جگہ دی ہے۔ تخلیق کار اپنے عہد کی اجتماعی صورتِ حال سے اثر قبول کرتا ہے اور سیاست چونکہ سماج کا ہی شعبہ ہے لہٰذا ادیب کے قلم سے نکلنے والی تحریر اپنے عہد کی ترجمان اور سماجی و سیاسی حالات و واقعات کی عکاس بن جاتی ہے۔

معاشرہ مسلسل تغیر پذیر رہتا ہے اور تبدیلی و انقلاب اس کے لیے ناگزیر ہیں۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں کئی قسم کے سماجی و سیاسی مسائل جنم لیتے ہیں۔ یہ تبدیلی اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آتی ہے چنانچہ ان مسائل کو سمجھنے کے لیے ایسے ذہن و فکر کی ضرورت ہوتی ہے جو ان جدید مسائل کو سمجھ سکے اور ان کی نشاندہی کر سکے۔ یہی سیاسی و سماجی تبدیلی ادب کے شعبے کو بھی متاثر کرتی ہے اور اس میں بھی کئی قسم کے نئے موضوعات و مسائل کو جنم دینے کا باعث

بنتی ہے۔ کسی بھی رسالے یا جریدے کا ہر نیا شمارہ ادب کی تازہ ترین صورت حال کو جاننے اور سمجھنے کا سب سے موثر ذریعہ ہوتا ہے اور رسالے کے دیگر مشمولات کی نسبت اس کے اداریے نئے موضوعات و مسائل کی نشاندہی اور ان کے حوالے سے بحث و فکر کی عمدہ مثال ہوتے ہیں۔

مدیرِ مکالمہ نے آغاز ہی سے مکالمہ کے اداریوں میں عصری سماجی و سیاسی حالات و واقعات کے تناظر میں تازہ مسائل و مباحث پر گفتگو کی ہے اور اپنی ادبی بصیرت سے قارئین کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھا ہے۔ مدیرِ مکالمہ نے مکالمہ کے اداریوں میں نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل کی نشان دہی کی ہے بلکہ ان مسائل کے پسِ پردہ عناصر کو بھی بے نقاب کیا ہے اور یوں مکالمہ حقیقی معنوں میں روحِ عصر کا نمائندہ ادبی رسالہ نظر آتا ہے۔

مکالمہ کے اداریوں میں ہمیں کن کن سیاسی و سماجی مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے اس سے پہلے مکالمہ کے عہدِ اشاعت کے سیاسی و سماجی پسِ منظر پر ایک نظر دوڑالی جائے اور دیکھا جائے کہ سیاسی و سماجی حالات و واقعات کی تبدیلی نے ادب میں کن رجحانات کو فروغ دیا اور ہمارے ادب پر کیا اثرات مرتب کیے۔ ان میں سب سے بڑا المیہ ہجرت کا المیہ ہے۔ اس ہجرت کے دوران برصغیر میں تاریخ کے بدترین فسادات رونما ہوئے۔ پاکستان سے ہندوستان یا ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرتے ہوئے لاکھوں افراد فسادات کی نظر ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب نے جو سب سے پہلا اثر قبول کیا وہ ہجرت کا واقعہ ہے۔ لہٰذا قیامِ پاکستان کے فوراً بعد لکھا گیا ادب ان فسادات کا ردعمل تھا۔ آزادی کے بعد کافی عرصہ ادب پر ہجرت کے المیے کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ مایوسی، شکست اور ناامیدی جیسے موضوعات ادب کا حصہ رہے۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ملک میں اقتدار کی ہوس کا کھیل جاری ہو گیا جس نے کبھی بھی پاکستان کو استحکام نصیب نہ ہونے دیا اور یوں پاکستانی سیاست میں آغاز ہی سے جمہوریت اور آمریت کی آنکھ مچولی رہی۔ ملکی تاریخ کا دوسرا بڑا سیاسی واقعہ مارشل لاء کا نفاذ ہے جس نے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا۔ یہ مارشل لاء (اکتوبر ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹) کے دس سالوں پر محیط ہے اور اس دوران کئی بڑے سیاسی واقعات رونما ہوئے جنھوں نے پاکستانی معاشرے کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ ان میں سب سے نمایاں واقعہ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہے۔ یہ ایک اہم قومی سانحہ تھا جس سے ادب میں قومی و ملی محبت کے موضوعات کو جگہ ملی اور ایسا ادب تخلیق کیا گیا جو قومی جذبے کو ابھارنے کا سبب بنا۔ ساٹھ کی دہائی میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک جو کہ خالصتاً سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ تھی، دم توڑ رہی تھی اور اس کے ردعمل میں دو نئی تحریکیں ''اسلامی ادب کی تحریک'' اور ''پاکستانی ادب کی تحریک'' منظر عام پر آ چکی تھیں۔ سیاسی عدم

استحکام نے جس معاشرتی بے سمتی کو جنم دیا اس کے اثرات ادب پر بھی دکھائی دیے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں جو ادب تخلیق ہوا وہ داخلیت کا حامل ہے۔ حقیقت نگاری کی بجائے داخلیت جیسے موضوعات ادب میں داخل ہونے لگے جو کہ سراسر ملکی سماجی و سیاسی صورتِ حال کا ردعمل تھے۔ اس دور میں بھی ہماری سیاست مارشل لا کے زیرِ اثر ہی تھی۔ لہٰذا جب ستر کی دہائی میں مارشل لاء کے خلاف سیاسی رد عمل آنے لگا تو اس کا اثر ادب پر بھی پڑا اور مزاحمتی ادب کا رجحان پروان چڑھا۔ اور اسی دوران فکر و اظہار پر پابندی کے بموجب ادب میں اسلوب کی سطح پر بھی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ ادیبوں نے علامت نگاری کا سہارا لیا مگر اپنے جذبات و احساسات کو ہر صورت صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا اپنا فرض سمجھا لہٰذا اس دور میں لکھا گیا ادب داستانوی انداز، تمثیل اور علامتوں کے ذریعے بیان کیا گیا۔

اسّی کی دہائی میں قومی سیاست میں ایسے مزید واقعات رونما ہوئے جنھوں نے قلب و ذہن کو شدید متاثر کیا اور ادیب چونکہ معاشرے کا سب سے زیادہ حساس عنصر ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان حالات کی حساسیت کو محسوس نہ کرے۔ ان واقعات میں قومی تاریخ کا ہجرت کے بعد دوسرا المناک واقعہ یعنی سقوطِ مشرقی پاکستان سرفہرست ہے۔ اس قومی سانحے کے بعد لکھے جانے والے ادب میں اس سانحے کی گونج بآسانی سنی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی ہماری سیاست کو استحکام نصیب نہ ہوا اور یکے بعد دیگرے کئی سیاسی واقعات نے براہِ راست معاشرے اور ادب کو متاثر کیا۔

> ضیاء الحق والے اسلامی مارشل لاء کہ جسے امریکی حمایت نے گیارہ سال تک پھیلا دیا تھا، بھٹو کی پھانسی، افغانستان میں امریکی مفادات کے تحفظ کو جہاد قرار دینا، روس کا ٹوٹنا اور ہماری تہذیبی حمیت کا پارہ پارہ ہونا ایسے سانحات کو لیے ہوئے تھا جو اس زمانے کے ادب کا مزاج بدلتے رہے۔[۲۷]

اکیسویں صدی ہمارے لیے دہشت کا ساماں لے کر آئی۔ خودکش دھماکوں کی صورت میں پاکستان نے دہشت گردی کی بہت قیمت چکائی جس کے ردعمل میں موت کی بے یقینی، خوف جیسے موضوعات ادب میں در آئے۔ ادب میں یہ موضوعات اس عہد کا تقاضا ہیں کیونکہ ادب اپنے اردگرد سے بہر حال متاثر ضرور ہوتا ہے۔

گزشتہ پچیس تیس سالوں میں اردو ادب پر مغرب کے جدید رجحانات کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہاں کی ادبی و فکری تحریکوں نیز دنیا کے سیاسی حالات اور ملکی فضا نے ادب کو متاثر کیا ہے اور اس طرح سیاسی و معاشرتی تناظر میں کئی جدید رجحانات نے اردو ادب میں نشو و نما پائی۔

ادب کا سماج سے گہرا رشتہ ہے۔ ادیب، اپنی تخلیق کے لیے خام مواد معاشرے سے حاصل کرتا ہے اور معاشرہ اپنے سیاسی، اخلاقی و معاشرتی رویوں کا اظہار ادب کی صورت میں کرتا ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے عہد کے

سیاسی حالات و واقعات اور سماجی نشیب و فراز کا اظہار بالواسطہ یا بالاواسطہ اس کی تخلیق میں کرتا ہے۔ ادب اپنے عہد کی صورتِ حال کا ترجمان و عکاس ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی معاشرے کو سمجھنے کے لیے اس کے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے اور ادیب اس سلسلے کا ایک اہم کردار ہے۔ مکالمہ کے شمارہ ۴ میں مدیرِ مکالمہ نے "ادیب، سیاست اور معاشرہ" کے عنوان سے ایک اداریہ رقم کیا جس میں انہوں نے ادیب کے مقام و مرتبے اور اس کی حدود و قیود کو واضح کیا ہے۔

چونکہ ادب سماج میں رہ کر ہی تخلیق کیا جاتا ہے لہٰذا تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے کا گہرا مشاہدہ کرے اور وہ اسی صورت بہترین ادب تخلیق کر سکے گا اگر اس کی نگاہ معاشرے کے بدلتے حالات و واقعات اور تبدیلیوں پر ہے اور وہ اپنے جذب و احساس کی گہرائی اور فن کارانہ بصیرت سے ان حالات و واقعات کی حقیقتوں کو تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مکالمہ کی پالیسی میں بھی اس بات کا واضح اظہار کیا گیا ہے کہ ادب سماج و سیاست سے الگ نہیں مگر معتدل رویہ اختیار کرنا ادیب کی ذمہ داری ہے اور یہ کہ اس کی تخلیق صحافتی رنگ لیے نہ ہو بلکہ اس میں ادب کا پہلو ہر حال میں موجود رہے۔

اختلافِ رائے جمہوریت کا حسن ہوتا ہے اور اسی طرح ادب میں بھی مختلف الآراء ادیبوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہی سوچ ادب میں تنوع کا باعث بنتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو ادب کو نظریاتی مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں جس کی بڑی مثال ترقی پسند تحریک ہے جب کہ کچھ کے نزدیک ادب کا سماج و سیاست سے کچھ سروکار نہیں۔ جیسا کہ احسن سلیم لکھتے ہیں کہ:

> عصر حاضر میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک کثیر تعداد افادیت اور مقصدیت میں یقین نہیں رکھتی۔ ان کے خیال میں مقصدیت کے زیرِ اثر تخلیق کردہ ادب میں سیاسی یا تبلیغی نعرے بازی کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ادب اپنے بنیادی وظیفے یعنی جمالیاتی حظ و مسرت سے عاری ہو جاتا ہے۔[۲۸]

مکالمہ میں ہمیں ان دو انتہاؤں سے انحراف کی پالیسی نظر آتی ہے۔ مدیر لکھتے ہیں کہ:

> ادب باربرداری کا جانور نہیں۔ اس سے نظریاتی پمفلٹ بازی کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ ادب انسان کے باطن میں اپنا کام کرتا ہے، اپنی روح سے مکالمہ کرتا ہے۔[۲۹]

اگر ادب کو صرف سماجی و سیاسی حالات و واقعات کے بیان تک محدود کر لیا جائے تو ادب کا دائرہ کار سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ سیاسی و سماجی مباحث اہم ہوتے ہیں کیونکہ انہی مباحث کے ذریعے ادب میں حال کے مسائل کی پیش کش ہوتی ہے اور قاری کو شعور و بصیرت عطا ہوتے ہیں کہ وہ ان مسائل کو جان سکے، کوئی رائے قائم کر سکے اور ان کا حل

تلاش کر سکے۔ حسن عسکری لکھتے ہیں کہ:

> ہمارے یہاں جو لوگ 'خالص ادب' کے قائل ہیں وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ادب میں سماجی عوامل یا سیاسی واقعات کا ذکر نہیں آنا چاہیے نہ ادیب کو ان معاملات میں پڑنا چاہیے۔ بعض دفعہ اس قسم کے اردو ادیب کچھ ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے کسی مغربی روایت کی پیروی کر رہے ہوں لیکن مجھے تو مغرب میں کوئی ایسی دقیق ادبی روایت نظر نہیں آتی جو سیاست سے اس درجہ گھبراتی ہو اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہنا چاہتی ہو۔ اس خلفشار کے زمانے میں ادب کو سب سے زیادہ خطرہ اسی ذہنیت سے ہے۔[۳۰]

معاشرہ ہر آن تبدیلی کا شکار رہتا ہے اور پاکستان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں کبھی بھی سیاسی استحکام نصیب نہیں ہوا۔ قیامِ پاکستان سے آج تک ملک کبھی مارشل لاء کی زد میں رہا تو کبھی حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ جب مکالمہ کا اجراء ہوا تو اس وقت حال ہی میں مارشل لاء کا خاتمہ ہوا تھا اور جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا تو اس دور میں جو ادب لکھا گیا اس میں ان سیاسی موضوعات کو جگہ دی گئی۔ سیاسی و سماجی موضوعات پر لکھنے میں کوئی قباحت نہیں مگر ان موضوعات پر لکھتے ہوئے جذباتیت اور نظریاتی بندش سے گریز کرنا چاہیے۔ مدیرِ مکالمہ نے بھی اس مسئلے کو اٹھایا اور ادیب کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے معتدل راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ ادیب کو مخاطب کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ایٹمی دھماکوں، کرگل کی محاذ آرائی اور پاکستان میں حالیہ حکومت کے خاتمے ایسے موضوعات اگر آج ہمارے ادب اور ادیبوں کی گفتگو کا عنوان بن رہے ہیں تو اس میں تردد کی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں! اس حوالے سے سوچنے اور دیکھنے کی بات اگر کچھ ہے تو صرف یہ ہے کہ ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارے ادیبوں کا رویہ ذرائع ابلاغ سے وابستہ افراد کا سا تو نہیں ہو رہا؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو ہمیں ضرور تشویش ہونی چاہیے اس لیے کہ ایسی صورت میں ادیب وہ کام کر رہا ہے جو اصل میں اس کے کرنے کا نہیں۔ اگر گفتگو ادب کے Parameters کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کی جا رہی ہے تو ہمیں اسے آگے بڑھانا چاہیے۔[۳۱]

سیاست سے وابستہ ادب اور اس کے سیاسی و نظریاتی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کی بڑی مثال ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھا گیا ادب ہے جو کہ ادب کی حقیقی روح کے خلاف ہے۔ ایسے ہی ادیبوں کو بطورِ مثال پیش کرتے ہوئے حال میں لکھنے والوں کے لیے جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> اگر ادیب خود کو سیاست سے وابستہ کر کے "ادبی تخلیق" کے خواہاں ہیں تو یہ ان کی اپنی

ذمہ داری ہے اور اب بھی وہ اسی غلطی کا اعادہ کریں گے جو ہم سے پہلے ایک نسل کر چکی ہے اور جس کی دریافت و انکشاف اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا ہی ہماری ذمہ داری ہے۔[۳۲]

اگر ہم پاکستان کی سیاست کی بات کریں تو ہمیں آج تک کسی بیانیے پر اتحاد نظر نہیں آتا۔ اقتدار کی ہوس، پارٹی بازی اور انتشار کی کیفیت ہی دکھائی دیتی ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں پاکستان ہمیشہ سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا۔ ہمارے ہاں اس سے زیادہ قابلِ تشویش بات یہ ہے کہ ادب کو بھی اہلِ سیاست و اہلِ اقتدار نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اگر سیاست ادب پر اثر انداز ہو تو ادب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے مدیر مکالمہ لکھتے ہیں کہ:

ادیب اور شاعر تاریخ نہیں لکھا کرتے لیکن تاریخ کے حقائق کو سند اور اعتبار کا حوالہ ضرور فراہم کر دیا کرتے ہیں ادب اور عصری آگہی کا آپس میں بس اتنا ہی سمبندھ ہوا کرتا ہے۔[۳۳]

ادب اور سیاست کے اسی تعلق پر مزید بحث کرتے ہوئے مبین مرزا لکھتے ہیں کہ

ادب کی معاشرے میں اثر آفرینی ایک طویل المعیاد پراجیکٹ ضرور ہے۔ لیکن جن معاشروں میں ادب زندہ رہتا ہے وہ اپنے تخلیقی سفر میں سیاسی اور اقتداری ہاتھوں کا کھلونا نہیں بنتا بلکہ ان سب سے بے نیاز ہو کر فکر و فن کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔[۳۴]

لہٰذا مکالمہ کی تحریروں کا جائزہ لینے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں شائع ہونے والی تحریریں ہر لحاظ سے ادب کے دائرہ کار میں آتی ہیں۔ ادب سے صحافتی کام لینے والی تحریروں و نگارشات کا مکالمہ سے کچھ واسطہ نہیں اور وہ کسی بھی قسم کی سیاسی وابستگی اور نظریاتی جکڑ بندی سے بالاتر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مکالمہ کے پہلے شمارے کے بعد اسے قارئین کی جانب سے پذیرائی ملی تو ان کی اس پالیسی کو درستی کی سند مل گئی۔ جیسا کہ مبین مرزا مکالمہ کے دوسرے شمارے کے اداریے میں لکھتے ہیں:

سیاسی میگنا کارٹا اور نظریاتی Barriers کے بغیر پیش کیے گئے ادب کا ہمارے معاشرے میں آج بھی چشم روشن اور دل شاد کے ساتھ استقبال کیا جاتا ہے۔[۳۵]

مکالمہ نے جہاں ادب اور سیاست و معاشرے کے تعلق و ربط کے حوالے سے اپنی پالیسی بیان کی ہے وہیں عصر حاضر میں درپیش ایک ایسے مسئلے کو بھی اجاگر کیا جس کا تعلق براہ راست سیاست کے ساتھ ہے۔

شمارہ ۶ کے اداریے بعنوان ''ادب اور حکومتی سرپرستی'' میں انہوں نے ادبی رسائل و جرائد کے مدیروں میں پنپ رہے ایک مضر رجحان پر تنقید کی ہے اور ان مدیروں کے اس رویے کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو حکومت سے

سرکاری سرپرستی کے خواہاں ہیں۔

ادب اور سیاست کا تعلق مندرجہ بالا سطور میں واضح کیا گیا ہے اسی تعلق کو مزید واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ادب اور حکومت کے اپنے اپنے سروکار ہوتے ہیں یہ دو الگ الگ دھارے ہی نہیں بلکہ ان کے سفر کی سمتیں بھی علیحدہ ہیں۔ حکومت کا تعلق افراد معاشرہ کی خارجی زندگی کے معاملات سے ہوتا ہے جب کہ ادب انسان کے باطنی تقاضے سے تعلق رکھتا ہے۔[۳۶]

ادیب کسی بھی سیاسی واردات کو اپنے انداز سے محسوس کر کے اپنے نقطہ نظر کے مطابق بیان کرتا ہے کیونکہ ادیب یا شاعر ہر با معنی تجربے سے کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتا ہے لیکن کسی اصول یا ضابطے کا پابند نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

> بے شک ادیب نہ تو پمفلٹ باز ہوتا ہے نہ سیاسی مبصر لیکن تخلیقی سطح پر اس کا اپنا نظریہ ہوتا ہے جس کے مطابق وہ کسی سیاسی واردات اور تجربے کی تعبیر اور ترجمانی کا حق ادا کرتا ہے۔[۳۷]

چنانچہ زیر بحث اداریے کے ادب پر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حکومتی سرپرستی میں چلنے والے ادارے کئی مراعات کے حق دار ہوتے ہیں جو کہ مادیت کے اس دور میں از حد ضروری ہیں مگر اس مطالبے کے لیے آواز اٹھانے والے مدیروں نے شاید اس پہلو پر غور نہ کیا ہو کہ سرکاری سرپرستی سے ادب کو مراعات تو مل جائیں گی مگر اظہار کی آزادی برقرار نہیں رہے گی۔ اگر حکومت ادب کی سرپرستی کرتی ہے تو پھر وہ ادب کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھے گی اور رسالے یا اخبار میں صرف اسی مواد کی اشاعت کا مطالبہ کرے گی جو حکومتی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوں گے اور جس کا مقصد حکومتی عہدہ داروں کی آسودگی ہو گا جو کہ ادب کے مقاصد کے بالکل منافی امر ہے۔ اس بات کی دلیل کے لیے وہ تاریخ کو اٹھا کر قاری کے سامنے لا رکھتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ادب کو بطور مثال پیش کرتے ہیں کہ سیاسی یا معاشی مقاصد کے لیے لکھا جانے والا ادب، ادب نہیں رہتا۔ جیسا کہ شمیم احمد لکھتے ہیں:

> انجمن ترقی پسند کے منشور اور مقاصد کے تحت جو کچھ لکھا گیا وہ تخلیقی اعتبار سے اتنا ناقص ہے کہ آج ان شاعروں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا جن کو کل سرخ گلاب اور سرخ مسافر قرار دیا گیا تھا اور وہی نام قابلِ اعتبار ٹھہرے جن میں کچھ نہ کچھ تخلیقی صلاحیت موجود تھی۔ ترقی پسند تحریک کا سب سے المناک رویہ یہ ہے کہ اس نے ادب کے لیے تخلیقی معیار اور صلاحیت کی بجائے سیاسی مقاصد کو اولیت دی۔[۳۸]

اسی طرح مارشل لاء کے ادوار میں جہاں حقیقی ادب لکھنے والوں نے اگرچہ علامتی انداز سے ہی اپنے قلم کی طاقت کا استعمال کیا اور مادی فائدے کے لیے ادب کو استعمال کیا۔ آج وہ تخلیقات "ادبی تخلیقات" میں شمار نہیں ہوتیں۔ یہ تو ماضی کی بات ہے جب ہم حال میں نظر دوڑائیں تو ہمیں ادیبوں کے اسی رویے کا ایک نیا رخ دکھائی دیتا ہے مکالمہ کے شمارہ ۴۰ (ستمبر ۲۰۱۸ء) کے اداریے میں مدیر مکالمہ نے ماضی کے اسی قسم کے رویے کو جو دورِ حاضر میں ادیبوں نے روا رکھا ہے، کے ادب پر ایک نئے اثر کی نشاندہی کی ہے۔ اس اداریے کو "ادب اور کردار" کا نام دیا گیا جس کا آغاز اس بحث سے کیا گیا کہ ماضی میں ادب نے ہمیں ایسے کردار دیے جو اپنی انفرادی شناخت رکھتے تھے اور ان کی اثر پذیری اس حد تک تھی کہ وہ آج بھی ہمارے ذہنوں میں نقش ہیں۔ اس بحث کو لے کر مدیر مکالمہ نے زمانہ حال کے ادب میں ایسے کرداروں کے ناپید ہونے کے متعلق سوال اٹھایا ہے اور اس کی وجوہات بیان کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

> اب ذرا ہم ٹھنڈے دل سے سوچیں اور حالات و حقائق کا جائزہ لیں تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ جو اہم ادب میں کردار کا بحران یا فقدان دیکھ رہے ہیں اس کی بنیاد فی الاصل ادیب کے کردار کے فقدان پر ہے۔[۳۹]

ادیب کے حالیہ کردار کو وہ یوں واضح کرتے ہیں کہ آج کا ادیب ادب پر سیاست کر رہا ہے وہ دنیاوی جاہ و حشمت کے حصول کا خواہاں اور اپنے فن کی اہمیت سے نا آشنا ہے۔ زیر بحث اداریے میں مبین مرزا نے کاٹ دار الفاظ میں دورِ حاضر میں ادیب کے اس مذموم کردار کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> اہم ادیب لوگ اعلیٰ اخلاق اور زندہ اقدار کی باتیں کرتے اور اہل سیاست کی فریب کاریوں اور ہوس پرستی کو قابل نفرت گردانتے ہیں، لیکن دوسری طرف وزیروں اور گورنروں کو اپنی تقریبات میں بھی بلاتے ہیں ان کے ساتھ بنائی گئی تصویریں فیس بک پر ٹانکتے اور اس پر اتراتے ہیں۔ جاہ و منصب اور عشرت و عیش کا کوئی موقع ہاتھ آئے تو اس کے لیے مرمٹتے ہیں۔[۴۰]

مدیر مکالمہ کے اس بیان سے مکالمہ کی ادارتی پالیسی بھی واضح ہوتی ہے کہ مکالمہ کا مقصد اشاعت کبھی بھی کسی طبقے کی آسودگی نہیں رہا اور ایسا ادیب جو ادب پر سیاست کرے مکالمہ کے لیے قابل قبول نہیں اور ایسا ادب جو حکومتی مقاصد کے تحت لکھا جائے مکالمہ میں قابل اشاعت نہیں کیونکہ ان کے نزدیک مکالمہ کا مقصد یہ ہے کہ:

> ادب کسی نظریے، کسی مینو فیسٹو اور کسی سیاسی و سماجی اور معاشرتی حکمت عملی کے تحت

تخلیق نہیں کرایا جاسکتا۔[۴۱]

ادب اور سیاست کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ "ادب و فن کا یہ خاصا ہے کہ وہ سیاست دانوں کے اصولوں اور فارمولوں پر پورا نہیں اترتا۔"[۴۲]

تخلیقی ادب کا سیاست سے براہ راست واسطہ ممکن نہیں لیکن ادب کا ایک اہم عنصر تنقید ہے۔ تنقید اور تخلیق ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ خالص تنقید ہی کسی تخلیق کے سیاہ و سفید اور حسن و قبیح کو واضح کر کے اس مقام و مرتبے کا تعین کرتی ہے۔

تخلیق میں کسی سیاسی واردات اور تجربے کو بیان کرنا مصنف یا تخلیق کار کے اپنے نقطہ نظر اور اندازِ فکر پر منحصر ہے۔ سیاست کے معاشرت پر اثرات کا اظہار ادب میں بین السطور بیان کرنا ممکن ہے۔ مگر ادبی اصول و ضوابط کے تحت رہتے ہوئے مگر تنقید کا دائرہ کار تخلیق سے مختلف ہے۔ تنقید براہِ راست معاشرت پر سیاست کے اثرات کا جائزہ لے سکتی ہے اور عصری ادب کا مطالعہ کر کے اس کے کھرے کھوٹے کو واضح کر سکتی ہے۔ مبین مکالمہ ۷ کے شمارے کے اداریے میں لکھتے ہیں:

> تنقید معاشرے پر سیاست کے اثرات کو اپنے مباحث میں ضمناً ٹٹول کر دیکھ سکتی ہے اس کا مقصد بھی صرف اس قدر ہو گا کہ انسان کو عدم وجود کے معاشرتی خوف سے آزادی دلائے اور تہذیبی فکر کے اس بیج کو تحفظ فراہم کرے جو انسانی روح کی زمین میں نمو پاتا اور پروان چڑھتا ہے۔[۴۳]

سیاسی، معاشرتی تغیرات انفرادی سطح پر فرد کے رویوں میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں اور انہی انفرادی رویوں سے اجتماعی رویے تشکیل پاتے ہیں اور معاشرے کی ایک صورت سامنے آتی ہے۔ عصر حاضر میں ملکی سیاسی و معاشرتی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے ہاں سیاسی عدم استحکام اور معاشی بدحالی نے ہمارے انفرادی رویوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ قیام سے لے کر آج تک ہمیں کبھی سیاسی استحکام نصیب نہیں ہوا اور نہ ہم نے معاشی خوش حالی کا دور دیکھا۔ غربت و افلاس نے ہمیشہ ہمارے معاشرے کی اکثریت کو اپنے جال میں جکڑے رکھا اس تمام صورت حال سے ہمارے ہاں صرف بے یقینی، خوف، بے زاری اور عدم اعتماد جیسے رویے ہی تشکیل پا سکتے ہیں۔ اسی معاشرتی مسئلے کی نشاندہی ہمیں مکالمہ کے اداریوں میں بھی ملتی ہے۔ مکالمہ ۹ کے شمارے میں جو اداریہ سپردِ قلم کیا گیا اس کا عنوان ہے "خوف، بے زاری اور ہمارا ادب" جس میں مدیر مکالمہ نے بیان کیا کہ آج کا ادب اس بات کی عکاسی کر رہا ہے کہ ہم بحیثیت قوم اور خوف اور بے زاری کے عارضے کا شکار ہیں۔ ہمارے ادب میں وجودیت جیسے

موضوعات اسی عصری سیاسی و سماجی صورت حال کی وجہ سے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ماجرا اصل میں یہ ہے کہ من حیث القوم ہمارے مزاج کی اس رد تشکیل یا یوں کہیے کہ نئی تشکیل میں دو عوامل نے بنیادی کردار ادا کیا ہے ایک سیاسی عدم استحکام نے اور دوسرے افراطِ زر نے۔[۴۴]

مادیت پرستی کے اس دور میں ان سیاسی و سماجی عوامل نے ہمارے رویوں پر جو اثر ڈالا اس نے ہماری تہذیب و اقدار اور انسانی تہذیب کو کچل کر رکھ ڈالا جس کی واضح باز گزشت آج کے ادب میں سنائی دیتی ہے۔ ادبی رسائل و جرائد تو وہی ادب شائع کریں گے جو ادیب تخلیق کرے گا۔ ایسے میں اگر ادیب ان رویوں سے متاثر ہو کر ان کیفیات کا اظہار اپنی تخلیقات میں کرے گا تو وہی ادب قارئین تک پہنچے گا اور اگر ادیب چاہے تو اپنے قلم کی آواز کو معاشرے میں تبدیلی کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ لہٰذا مکالمہ کی پالیسی یہ ہے کہ ایک ادبی جریدے کو ادب کی اشاعت کے وقت اس بات پر دھیان دینا چاہیے کہ وہ ایسا ادب شائع کرے جو انسانی تہذیب و اقدار کی بحالی کا سبب بن سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات و واقعات ہماری سوچ کو متاثر کرتے ہیں اور ادیب چونکہ معاشرے کا سب سے حساس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ان واقعات کا سب سے زیادہ اثر لیتا ہے اور ان کے خلاف ردِ عمل بھی دیتا ہے۔ یہاں مکالمہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ادباء سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز بلند کریں اور مظلوم کی حمایت کریں اور یہی عصرِ حاضر میں ادب کا کام ہے۔

ادب سماج میں رہ کر ہی تشکیل پاتا ہے اور افراد معاشرہ کے لیے ہی لکھا جاتا ہے۔ یوں ادب اور افرادِ معاشرہ کا رشتہ لازم و ملزوم ہے۔ ادب کی تخلیق تب تک ہی ہوتی رہے گی جب تک اسے قاری کا ساتھ میسر رہے گا اور معاشرہ چونکہ ہر دم تغیرات کا شکار رہتا ہے اور یہ تغیرات، سماجی، سیاسی، معاشی، مذہبی محرکات کے زیر اثر ہوتے رہتے ہیں۔ انہی سماجی رجحانات میں تبدیلی اور تغیر ادبی رجحانات میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ جب مارشل لا کے زیرِ اثر معاشرہ میں اظہارِ رائے کی آزادی پر قدغن لگائی گئی تو ادب میں مزاحمتی رجحان نے جنم لیا اور اسلوب نے بھی کئی رنگ بدلے۔ ادب میں علامتی انداز اسی دور کا رجحان ہے اور اس رجحان نے ادب کے قاری کو بھی متاثر کیا۔ یوں اس دور و یہ تبدیلی کا اثر ہر دور اور ہر زمانے میں جاری و ساری ہے۔ اسی سماجی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مدیرِ مکالمہ نے مکالمہ کے شمارہ ۲۱ کے لیے "اکیسویں صدی میں ادب اور قاری کا رشتہ" پر ایک اداریہ سپردِ قلم کیا جس میں انہوں نے عصرِ حاضر میں اس کمزور ہوتے ہوئے رشتے کی وجوہات کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔ اس اداریے میں انہوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ ادب کے مطالعے کی کمی کا رجحان صرف قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی مسئلہ

ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کی وجوہات کا جائزہ بھی لیا گیا مگر ملکی سطح پر اس رجحان کی وجوہات کو جس طرح انہوں نے دیکھا یہ ان کی ادبی بصیرت کا کمال ہے۔

ادب افرادِ معاشرہ کی ذہن سازی اور کردار سازی میں مثبت کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ادب کی ایک سنجیدہ ذہنی سرگرمی ہے جو پڑھنے والوں کو سوچ بچار پر اکساتی ہے مگر اس جدید دور میں صورتِ حال بہت بدل چکی ہے۔ ہم ایک طویل عرصہ نو آبادی میں رہے ہیں۔ ہم آزاد ہیں مگر دیکھا جائے تو ذہنی طور پر ہم آج بھی ذہنی غلامی کا شکار ہیں۔

مدیرِ مکالمہ کے مطابق یہ اتفاق نہیں بلکہ عالمی طاقتوں کی کارستانی ہے جو وہ جدید ٹیکنالوجی (الیکٹرونک و سوشل میڈیا) کے ذریعے آج بھی ہمارے قلب و ذہن کو کنٹرول کیے ہوئے ہیں اور ہم آج آزاد ہوتے ہوئے بھی نو آبادیاتی نظام میں ہی گرفتار ہیں۔ قاری کو آج تفریح کے بیش بہا مواقع دستیاب ہیں لہٰذا ایسی صورت میں وہ ادب کی طرف کیسے مائل ہو؟ چنانچہ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:

> کیا معاشرہ اور اس کے افراد تفریح اور آسائش کو چھوڑ کر کسی ادب جیسی سنجیدہ اور ذہنی سرگرمی کی طرف مائل ہوں گے؟[۴۵]

وہ اس اہم مسئلے کی دوسری وجہ ذہن سازی اور سماج کی صورت گری کرنے والے اداروں کی لاپرواہی کو قرار دیتے ہیں جو اپنی ذمہ داری درست طور پر ادا نہیں کر رہے کیونکہ سماجی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر ان اداروں کا ایک خاص مقام ہے۔

مدیرِ مکالمہ کے نزدیک اسی مسئلے کی تیسری اور اہم وجہ دورِ حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کا رویہ ہے جو مادیت پرستی کا شکار ہو کر اپنی ذمہ داریوں سے غافل اور اپنے سماجی مقام و مرتبے سے بے پرواہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ادیب کا مزاج، اس کا کردار اور طرزِ عمل یکسر بدل گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے فن سے جو کلامیہ تشکیل پاتا ہے اس میں عوامی ایڈیم نہیں ملتا اور سماجی شعور سے، حرارت سے عاری نظر آتا ہے۔ ایسے میں ادب اور ادیب کو قاری بھلا کیوں میسر آ سکتا ہے؟[۴۶]

اس تمام صورتِ حال کو واضح کرنے کے بعد وہ ابھی بھی مایوس نظر نہیں آتے بلکہ ادبی رسائل و جرائد کی اشاعت کو ایک مثبت قدم قرار دیتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں قومی سطح پر ایک بار پھر ادب اور قاری کا رشتہ بحال ہو گا اور اس سلسلے میں وہ ادیب سے اس کے فعال کردار کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مکالمہ کے شمارہ ۲۳ کی اشاعت کے ساتھ ہی یہ ماہانہ شائع ہونے لگا۔ ماہانہ اشاعت کے اس پہلے شمارے کے اداریے کو "مفروضہ حقیقت کی دنیا اور ادب" کا عنوان دیا گیا اور اس میں اسی مسئلے کے تسلسل کو برقرار رکھا گیا اور

مکالمہ کی اشاعت کو کچھ یوں جواز فراہم کیا گیا:

> کسی بھی عہد اور اس کی تہذیب کے زندہ ضمیر کی آواز سب سے صاف اور واضح لہجے میں
> ادب کے ایوانوں میں گونجتی اور اس کے اوراق کی سماعت گاہوں میں محفوظ ہوتی ہے۔[۴۷]

ادب اپنے عہد کے تناظر میں درپیش سوالوں کا جواب فراہم کرتا ہے۔ تہذیب کی بقا کا باعث بنتا ہے اور آج کے دور میں معاشرے کی اہم ضرورت ہی تہذیب کی بقا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مکالمہ کا مقصدِ اشاعت بھی یہی ہے اور اس کی ماہانہ اشاعت کا محرک بھی یہی ہے تاکہ مکالمہ بہتر طور پر اپنی ادارتی پالیسی اور مقاصد پر عمل درآمد کر سکے۔

ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ادب میں نئے رجحانات جنم لیتے ہیں۔ سیاسی و سماجی حالات و واقعات ادیب کی سوچ کا رخ موڑنے کی طاقت رکھتے ہیں اور ادیب جب ان واقعات کو ادب میں ڈھالتا ہے تو اس کا قلم معاشرے کی سوچ کے دھارے میں تبدیلی لانے کی سکت رکھتا ہے یوں یہ ادیب اور معاشرہ لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ادیب کا کردار صحافی جیسا نہیں کہ وہ کوئی خبر نشر کرے نہ ہی کسی سیاسی نمائندے جیسا جو جانب داری کا مظاہرہ کرے اور نہ ہی وہ کوئی حکومتی نمائندہ ہے کہ عوام کی بات حکومت تک پہنچائے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں ہم حالتِ جنگ میں ہیں، ایسی صورت میں ادیب کا کردار کیا ہو گا؟ یہ دورِ حاضر کا اہم سوال ہے۔

مکالمہ کے اداریوں کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مدیرِ مکالمہ عصری ملکی و سماجی صورت حال سے پوری طرح باخبر اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ وہ ادیب کے مقام و مرتبے سے بھی آشنا ہیں۔ چنانچہ وہ مکالمہ کے لیے ہر لکھنے والے بلکہ ہر تخلیق کار کو اس کے مقام سے آگہی دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> آج ادیب کا کردار معاشرے میں وہ نہیں ہے جو اگلے وقتوں میں ہوا کرتا تھا۔ ہر زمانے
> کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور ادیب کو اپنی باشعور حیثیت کے پیشِ نظر بدلتے تقاضوں
> اور زمانے کے حقائق کو جانچنا چاہیے۔[۴۸]

موجودہ دور اور اس کی سماجی و قومی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آج کا دور تیز رفتاری کا دور ہے۔ اب کوئی بھی مسئلہ طویل مدت کے لیے موضوعِ بحث نہیں رہتا کیونکہ اس کی جگہ بہت جلد کوئی دوسرا مسئلہ یا موضوع لے لیتا ہے۔ ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کے لیے ادیب کے سامنے ان موضوعات کی کیا حیثیت ہو گی، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ادب تو دائمی اقدار سے سروکار رکھتا ہے تو پھر عصرِ حاضر کے ہر دم بدلتے حالات و واقعات سے اس کا کیا تعلق ہو گا۔ اس بات کا جواب مکالمہ کے اداریوں میں یوں ملتا ہے:

یہ ٹھیک ہے کہ ادب دائمی اقدار سے سروکار رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آج وہ
اپنے عہد کی سچائیوں کو فراموش بھی نہیں کر سکتا۔[۴۹]

چنانچہ اس مسئلے کی بابت مکالمہ کی ادارتی پالیسی یہ ہے کہ ادیب کو معاشرے کے ان متغیر حالات سے تعلق قائم کرنا ہو گا اور اگر وہ معاشرے کا فعال رکن ہے تو اسے اس بات کا ثبوت دیتے ہوئے ان عارضی مسائل پر بھی قلم اٹھانا ہو گا۔ مبین مرزا کہتے ہیں:

ادب انسانی تجربے کے جمالیاتی اظہار سے عبارت ہے اور عصرِ حاضر کی انسانی زندگی اور
اس کا تجربہ سیاسی عوامل و عناصر کے بغیر نہ تو مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی اس کو سمجھا جا سکتا
ہے۔ آج کا ادیب اپنے عہد کی سیاسی صورتِ حال اور اس کے انسانیت پر اثرات کو
جانے بغیر عصری شعور کا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔[۵۰]

چونکہ مدیر کا کام لکھنے والوں کی درست سمت راہنمائی اور انہیں درست راستہ دکھانا ہوتا ہے لہٰذا اس بیان کے بعد وہ اس ردِ عمل کی توقع رکھتے ہوئے کہ قارئین اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یوں ادب کی حدود متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے (کہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے) کہتے ہیں:

اس گفتگو کا مقصد یہ نہیں کہ نئے ادب اور نئے ادیب کے تخلیق کرنے کا کوئی فارمولا
بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے بلکہ وہی پرانی اور چھوٹی سی بات کہ اسے معاصر سچائیوں
سے منھ نہیں موڑنا چاہیے۔[۵۱]

مکالمہ ۱۸ کے شمارے کے لیے لکھے گئے اداریے میں ادیب کی سماجی وابستگی کے سوال کو ایک بار پھر اٹھایا گیا اور عالمی ادب کے ساتھ اس کا تعلق قائم کرتے ہوئے اسے ملکی صورت حال پہ منطبق کیا گیا کہ ہر دور کے لکھنے والوں نے اپنے سماج کے ساتھ وابستگی ظاہر کی اور وفاداری کا اظہار کیا۔ لہٰذا آج اگر ہم ادیب اور تخلیق کار سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ انسانی اقدار کی بحالی اور تہذیب کی بقا کے لیے کام کرے تو اسے پہلے اپنے عہد اور سماج کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہو گا۔ چنانچہ ہمارے ہاں ملکی سیاسی و سماجی صورتِ حال کے تناظر میں ادیبوں اور شاعروں کی ذمہ داری کچھ یوں ہے:

آج پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنے عہد کے مطالبات کو سمجھتے ہوئے اپنے
تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے امتیازی نشانات کی بقا اور تحفظ کا نہ صرف ادراک
کرنا ہے بلکہ اپنے فن کے ذریعے اس شعور کو اجاگر بھی کرنا ہے۔[۵۲]

ادیب کی اسی سماجی ذمہ داری کو ایک بار پھر موضوعِ بحث بنایا گیا اور شمارہ نمبر ۳۵ (اگست ۲۰۱۷ء) کے لیے

لکھے گئے اداریے بعنوان ''ادیب اور مصلحت'' میں ادیب کی ذمہ داریوں کو ایک بار پھر دہرایا گیا اور کہا کہ ادیب کبھی بھی مصلحت کا شکار ہو کر اپنے قلم کو بیچتا نہیں بلکہ وہ اپنی روح کی سچی پکار پر لبیک کہتا ہے۔

دورِ حاضر میں ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ بدامنی اورانتشار ہے۔ دہشت گردی کے ناسور نے ہمارے معاشرے کو بری طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ملکی سطح پر قیامِ امن ایک بڑا سوال ہے، اسی مسئلے پر مکالمہ ۲۰ کے شمارے کے اداریے بعنوان ''ادیب اور قیامِ امن'' میں بحث کی گئی ہے جس میں دہشت گردی کی اس فضا میں قیامِ امن میں ادیب کے کردار کو موضوعِ بحث بنایا گیا۔ حالیہ عصری صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں دہشت گردی اور بدامنی کے عفریت کا قبضہ نظر آتا ہے اور یہ بدامنی صرف دہشت گردی کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ ہمارے ہاں اس کی دیگر کئی صورتیں ہیں، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> سماجی استحصال، سیاسی عدم برداشت، گروہی تعصب، لسانی تفریق اور ثقافتی اختلاف نے ہمارے یہاں مختلف صورتوں اور متعدد سطحوں پر بدامنی کو فروغ دیا ہے۔[۵۳]

ایسی صورتِ حال میں ملکی سطح پر سب سے بڑی ضرورت امن کے قیام کی ہے۔ اور دیکھا جائے تو امن کے قیام اور دہشت گردی کے خاتمے کی ذمہ داری حکومت اور سیاسی صاحبِ اقتدار لوگوں کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ امن کے قیام کے مجاز اداروں مثلاً فوج نے یہ ذمہ داری بخوبی نبھائی ہے اور ''ضربِ عضب'' جیسے آپریشنز سے اس پر بڑی حد تک قابو پالیا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار خارجی ماحول کا اثر ہر صورت قبول کرتا ہے لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ادیب اس ملکی صورتِ حال کا اثر قبول نہ کرے۔ تو عصرِ حاضر کے اس سب سے بڑے ملکی مسئلے کے تناظر میں اس کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ لہٰذا زیرِ بحث اداریے میں مدیرِ مکالمہ اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ ادیب کا دائرہ کار کہاں تک ہے، مگر ادیب کے کردار پر بات کرنے سے پہلے وہ یہ بات دوٹوک انداز میں واضح کرتے ہیں کہ امن کا قیام ادیب کی ذمہ داری نہیں یہ حکومت اور حکومتی اداروں کا کام ہے اور وہ یہ کام بطریقِ احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان حالات میں ادیب کا کوئی کردار نہیں۔ ادیب تو اپنے قلم کی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے اپنی تخلیقات کے ذریعے سوچ کے دھاروں کو تبدیل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ مبین مرزا لکھتے ہیں کہ:

> افرادِ قوم کی ذہن سازی میں ادیب کا ایک اہم اور موثر کردار بہر حال ہو سکتا ہے۔ یہ کردار وہ عملاً دو سطحوں پر ادا کرتا ہے، نظریاتی اور ذہنی سطح پر اپنی تحریروں کے ذریعے جیسا کہ سب بڑے ادیب ایسے حالات میں اپنے اپنے معاشروں میں ادا کرتے آئے ہیں۔[۵۴]

ایسی صورتِ حال میں مکالمہ کی پالیسی یہ ہے کہ ادیب سیاسی مصلحت اور ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے باک انداز میں اپنی سوچ، فکر اور روح کی آواز کو احاطۂ تحریر میں لائے اور ایسا ادب تخلیق کرے جو انسان کے انسانیت پر یقین کو از سرِ نو زندہ کرے تا کہ بے دردی اور سفاکی کے حالیہ رویوں پر قابو پایا جا سکے۔

عصرِ حاضر کی بدامنی اور انتشار نے ہر طبقہ فکر اور ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا جس سے یقینی طور پر ادب کا شعبہ بھی متاثر ہوا۔ مگر حالات کی خرابی ادب کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ شمارہ ۲۷ کے اداریے میں ''ادب اور خراب حالات'' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں ان ادیبوں اور تخلیق کاروں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ ادب میں زوال کی وجہ حالات کی خرابی اور زمانے کی خرابی کو قرار دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خراب حالات مایوسی اور ناامیدی کے رویوں کو جنم دیتے ہیں مگر انسانی ذہن و دماغ کو اللہ تعالیٰ نے وہ صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ ناساز گار حالات سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت اور مایوس کن حالات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ پریشان کن حالات میں اس کی صلاحیتیں بہتر طور پر کھل کر سامنے آتی ہیں۔

زیرِ بحث اداریوں میں مدیرِ مکالمہ اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ماضی کی مثالوں کو پیش کرتے ہیں اور انہوں نے وہ تمام ادوار قاری کے روبرو رکھ دیے جن میں حالات کی خرابی آج کے دور کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھی مگر اس دور میں ادب نے اپنا لوہا منوایا۔ میرؔ و غالبؔ کا دور ہندوستان کی معاشرتی و سیاسی ابتری کا دور تھا۔ عہدِ اقبال، منٹو، پریم چند، قرۃ العین، انتظار حسین جیسے بڑے ادیبوں کے حالاتِ زمانہ کو بطورِ مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> صاف نظر آتا ہے کہ حالات کے دباؤ نے، ذہنی اور اعصابی تناؤ نے تخلیق کار فن کار کو مضمحل یا معطل کر کے ایک طرف نہیں ڈالا بلکہ اس کی قوتِ اظہار اور نفسِ ناطقہ کو متحرک کیا ہے۔[۵۵]

اپریل ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شامل اداریے میں ایک بار پھر اس مسئلے کو موضوعِ بحث بنایا گیا جس کو ''بحران کے دنوں میں ادب'' کا عنوان دیا گیا۔ حالیہ سیاسی صورتِ حال نے خوف، دہشت اور مایوسی کے جس رویے کو فروغ دیا ہے اس کا اثر ادیب پر ضرور پڑتا ہے، وہ بھی اس سے ویسے ہی متاثر ہوتا ہے جس طرح ایک عام انسان متاثر ہوتا ہے۔ مگر اس صورتِ حال میں ایک ادیب کا ردِ عمل ایک عام انسان سے مختلف ہونا چاہیے۔ اس رویے کو مبین مرزا یوں واضح کرتے ہیں:

> ابتری کے نقشے میں وہ زندگی کا راستہ تلاش کیے بغیر نہیں رہتا۔ وقت کی بے مہری اسے وقتی مایوسی سے دوچار تو بے شک کرتی ہے لیکن وہ مستقل اندھیروں میں رہنے پر آمادہ نہیں ہوتا، وہ روشنی کی کرن دریافت کرتا ہے اور اسے لے کر آگے چلتا ہے۔[۵۶]

ہمارا ایک قومی مسئلہ جو کہ بڑی حد تک سیاست کے زیرِ اثر ہے وہ قومی زبان اردو کے نفاذ کا مسئلہ ہے۔ اردو زبان کو عملی طور پر بطور سرکاری زبان نافذ کرنے کا مسئلہ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق دس سال میں اردو کا نفاذ عمل میں لانا تھا جو کہ تاحال ممکن نہ ہو سکا۔ اردو زبان کے نفاذ، فروغ اور ترویج و ترقی کے لیے حکومتی سطح پر کئی ادارے کام کر رہے ہیں، مگر اس کے باوجود عالم یہ ہے کہ آزادی کے بعد پون صدی گزر جانے کے باوجود بھی اردو کا نفاذ عمل میں نہ آ سکا۔ اس مسئلے کی وجوہات کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب لینے کے لیے عبدالرحیم خان نے مقتدرہ قومی زبان کے سابقہ حکام کے سامنے یہ سوال رکھا کہ اردو کے نفاذ کی راہ میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں؟ اور اس مسئلے کا حل کیوں کر ممکن ہے؟ اس پیچیدہ سوال کے مختلف جوابات سامنے آئے مگر اکثریت نے اسے اربابِ سیاست کی غفلت ولاپرواہی قرار دیا۔

مقتدرہ کے سابق صدر افتخار عارف نے کہا کہ نفاذِ اردو کا فیصلہ اربابِ سیاست کا کام ہے۔ سابق معتمد زینت اللہ خان کے مطابق اصل مسئلہ بیوروکریسی ہے جو اردو کا نفاذ نہیں چاہتی۔ ان کا کہنا ہے:

> اصل فیصلہ ساز decision makers سیاست دان ہیں لیکن ان کے رویوں میں بھی کوئی گرم جوشی نظر نہیں آتی۔[۵۷]

باقر اعجاز نسیم نے بھی اردو کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ بیوکریسی کو ہی قرار دیا اور اس نے کہا کہ اس مسئلے کا حل حکومت کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے تو اردو کا نفاذ عملی طور پر ممکن ہو سکتا ہے۔ سابق معتمد آغا طارق اور محمد اکرم بلال کے مطابق بھی اس مسئلے کی وجہ سیاسی عزم کا فقدان ہے۔ اسی مسئلے کی نشاندہی، اس کے حل میں التوا کی وجوہات اور ان کا ممکنہ حل ہمیں مکالمہ کے شمارہ ۲۸ کے اداریے میں بھی نظر آتا ہے جس کا عنوان ''قومی سرکاری زبان کا مسئلہ'' ہے۔ جنوری ۲۰۱۷ء کے اس شمارے میں مدیرِ مکالمہ نے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام مادری زبانوں کے حوالے سے دوروزہ سمپوزم کا ذکر کیا اور اس میں ہونے والی بحث کا ذکر کرتے ہوئے قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے اس بل کا بھی ذکر کیا جس میں کہا گیا تھا کہ آئندہ برسوں تک اردو زبان کے نفاذ کے لیے اقدامات کی تکمیل تک انگریزی کو ہی سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہے گا اور اس دوران اردو کے نفاذ کے اقدامات مکمل کیے جائیں گے۔

اس سمپوزم میں ہونے والی گفتگو کے بعد مدیرِ مکالمہ نے اس عصری مسئلے کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کے مطابق آج تک اردو کے بطور عملی سرکاری زبان نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے اندر قومی طرزِ احساس کی کمی ہے کیونکہ ہمارے ہاں ہمیشہ ہر معاملے میں گروہی تعصبات اجتماعی تشخص پر بازی لے

جاتے ہیں اور ہر مسئلہ سیاست کی نظر ہو جاتا ہے۔ یہی حال اردو کے نفاذ کا بھی ہے۔ چنانچہ وہ اس مسئلے کا حل یوں بتاتے ہیں کہ اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ فردِ واحد سے لے کر قومی سطح پر احساس، شعور اور قومی طرزِ فکر کی تشکیل ہو اور اس مقصد کے لیے وہ ادیب کو اپنا مثبت کردار ادا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ادیب کے ساتھ ساتھ وہ ملکی ذرائع ابلاغ کے اداروں کو بھی موثر کردار ادا کرنے کا کہتے ہیں کیونکہ ادب، میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ادارے کسی بھی بیانیے کی تشکیل میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ادب اور سماج کا رشتہ تو لازم و ملزوم ہے۔ ادب افرادِ معاشرہ کے لیے ہی لکھا جاتا ہے اور یہ ادب ان افراد تک کیسے پہنچے گا اس کا تعلق ادب کی سماجیات سے ہے۔ ہر دور میں ادب کی سماجیات کا معیار اور طریقہ کار مختلف رہا ہے مگر دورِ حاضر میں ادب کی سماجیات کی کیا صورتِ حال ہے اس پر مکالمہ کے شمارہ ۳۷،۳۶ میں تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔ ''ادب کی سماجیات اور ہمارا عہد'' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں اس موضوع کو موضوع بنایا گیا۔ ادب کی تخلیق کے ساتھ ہی قارئین تک اس کی ترسیل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں نمائش پسندی کا دور ہے اور معاشرے میں یہ رجحان اس قدر سرایت کر چکا ہے کہ ادب جیسا شعبہ بھی اس سے بچ نہیں سکا۔ اس اداریے میں ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے نمائش پسندی کے رجحان کے خلاف مدلل گفتگو کی گئی اور دورِ حاضر کے اس مسئلے کو نہایت عمدگی سے بیان کیا۔ اس اداریے میں مصنف نے سب سے پہلے تو اظہار اور نمائش پسندی کے فرق کو واضح کیا۔ ادب تخلیق کار کے خیال، سوچ اور تصور کا اظہار ہوتا ہے۔ خیالات کے اظہار کی خواہش ہی اسے فن پارے کی تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ ادب کے ذریعے اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ یہ اظہار کی خواہش نمائش کی حد تک پہنچ چکی ہے اور اس جدید دور میں ادب سے وابستہ افراد بے بنیاد اور بے مقصد مشاغل میں الجھے پڑے ہیں۔ ان بے مقصد مشاغل کو مدیرِ مکالمہ نے یوں بیان کیا ہے:

> ادب جو کہ اصل شے ہے وہ اب پس منظر میں ہے اور اس کے نام پر کھیل تماشا ہر جگہ نظر آتا ہے۔ یہ جو آئے دن ہم سنتے اور دیکھتے ہیں کہ کہیں ادب کا فیسٹول چل رہا ہے، کہیں سیمینار ہو رہا ہے اور کہیں کانفرنس۔ یہ سب اس دور میں خاص اہمیت حاصل کر گیا ہے۔[۵۸]

ادب ہمیشہ سے فکری مقاصد کا حامل رہا ہے مگر مقامِ افسوس یہ ہے کہ ان مشاغل کے ذریعے ان فکری مقاصد کا حصول ممکن نہیں ہو رہا۔ مدیرِ مکالمہ نے اس مسئلے کو اجاگر کیا کہ آج کل جو بے تحاشا کانفرنسز، سیمینارز اور مشاعرے ہو رہے ہیں، ان کا مقصد یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس سے ادب کی عام لوگوں تک رسائی کو ممکن بنایا جاتا ہے اور یہ تمام ایونٹس عام لوگوں کی ادب سے آگہی اور دلچسپی کے لیے منعقد کرائے جاتے ہیں اور یہی آج کے دور میں ادب

کی سماجیات ہیں۔ مگر مکالمہ کی پالیسی یہ ہے کہ ادب کی عام آدمی تک ترسیل کے لیے موجودہ دور کے ادب کی سماجیات بے بنیاد ہیں اور ادب کے فروغ میں ان سب تقاریب کا کوئی تعلق نہیں۔

وقت کا تغیر معاشرتی تبدیلیاں لاتا ہے اور سماجی و اخلاقی اقدار بھی تغیر پذیر رہتی ہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی سماجی و اخلاقی اقدار ہوتی ہیں جو اس معاشرے کی تہذیب و ثقافت کے زیرِ اثر پروان چڑھتی ہیں۔ اسی طرح فحاشی کا تصور بھی ہر معاشرے میں الگ ہوتا ہے۔ ادب میں فحاشی کا موضوع ہر دور میں موضوعِ بحث رہا ہے۔ مکالمہ کے مباحث میں اس موضوع پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا۔ دورِ جدید میں فحاشی کا کیا تصور ہے؟ فحش نگاری کی وجوہات اور قارئین پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ماضی میں فحاشی کا کیا تصور تھا؟ ان سب سوالات کو مکالمہ کے شمارہ ۱۱ کے اداریے میں موضوع بحث بنایا گیا، جسے ''ادب، فحاشی اور معاشرہ'' کا عنوان دیا گیا۔ مکالمہ کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ قارئین تک معیاری ادب پہنچایا جائے۔ لہٰذا اس سماجی مسئلے پر قلم اٹھانا آج کے ادب کا تقاضا ہے تاکہ فحاشی و عریانی کے متعلق مکالمہ کی پالیسی قارئین اور ادیبوں پر واضح ہو جائے۔ مبین مرزا نے نہایت عمدگی سے تجزیہ کر کے قارئین کے سامنے فحاشی کی تعریف پیش کی۔ مکالمہ کا فحاشی و عریانی کے حوالے سے کیا نقطۂ نظر ہے اس کا اندازہ مبین مرزا کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> جنسی حسیت یا اس کے پہلوؤں کا ایسا بیان جس میں پڑھنے والے کے لیے اصل مسئلہ ثانوی درجے کا ہو جائے اور لذتیت غالب آ جائے فحاشی میں شمار ہو گا۔[۵۹]

کسی بھی تہذیب و معاشرے کے تناظر میں فحاشی کا ایک جیسا معیار نہیں چونکہ فحاشی کا تعلق کسی بھی خطے یا علاقے کی سماجی و اخلاقی اقدار سے ہے اور یہ اقدار تغیر پذیر ہیں، گزرتے وقت کے ساتھ اور حالات کی تبدیلی سے یہ بدلتی رہتی ہیں۔ اسی طرح فحش نگاری کا جو تصور ایک علاقے میں ہے اسی زمانے میں کسی اور خطۂ ارض پر شاید ویسا تصور نہ ہو۔ جیسا کہ اشعر نجمی لکھتے ہیں:

> نظام اخلاق کوئی جامد شے نہیں جسے ایک دفعہ وضع کر لیا جائے اور پھر اسی کسوٹی پر ہر زمانے اور ہر معاشرت کو پرکھا جائے۔ زمانے کے ساتھ اخلاق کے پیمانے بھی بدلتے رہتے ہیں اور اخلاق کا تعلق معاشی اور سماجی اقدار کے ساتھ بڑا گہرا ہوتا ہے، لہٰذا اقتصادی اور سماجی تعلقات کی نوعیت کے مطابق اخلاقی اقدار بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔[۶۰]

لیکن کوئی فن پارہ فحش ہے یا نہیں اس بات کے لیے ایک اصول دائمی ہے جسے مبین مرزا نے یوں بیان کیا:

> فن کار نے جو مسئلہ پیش کیا ہے اگر وہ واقعی اتنا بڑا ہے کہ ہم اسے خالص انسانی سطح پر رکھ کر دیکھ سکیں تو باقی سب باتیں ثانوی ہو جاتی ہیں اور فن پارہ فن کے معیار پر آ جاتا

ہے۔ بصورتِ دیگر فحاشی کے کھاتے میں جا پڑے۔[۴۱]

زیرِ بحث اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے فحش نگاری کے حوالے سے عصرِ حاضر کا جو المیہ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ آج ہم جدت پسندی کی آڑ میں بے تہذیب معاشرے کی بنیادیں رکھ رہے ہیں جو ہمیں اخلاقیات سے دور کر رہا ہے۔ اور جس معاشرے میں کوئی اخلاقی اقدار نہ ہوں وہاں کسی شے کے فحش ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آج کے دور میں آزادئ اظہارِ رائے کے نام پر فحاشی معاشرے میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ اس کا احساس بھی ختم ہوتا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ماضی میں جن فن پاروں پر فحش نگاری کا الزام لگا آج اس سے کئی گنا زیادہ فحش مواد میڈیا پر دکھایا جا رہا ہے۔

مکالمہ کے مباحث میں فحش نگاری جیسے اہم سماجی مسئلے پر کھل کر بات کی گئی ہے اور مکالمہ کی پالیسی اس حوالے سے یہ ہے کہ مکالمہ میں جنسی موضوعات پر لکھنے کی پابندی نہیں لیکن شرط صرف یہ ہے کہ وہ تخلیقات ہماری اخلاقی اور تہذیبی اقدار سے متصادم نہ ہوں اور مکالمہ کی ادارتی پالیسی پر پورا اترتی ہوں۔ ادب میں فحاشی کے حوالے سے مبین مرزا نے مکالمہ کا نقطۂ نظر یوں بیان کیا ہے:

> تسلیم کرنا چاہیے کہ جنسی حسیت اور جنسی عمل ہماری زندگی کا حصہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا بیان ادب کے لیے شجرِ ممنوعہ نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو اس کو کہیں ادب بنا دیتی ہے اور کہیں فحاشی؟ اس کو میپلیکس سوال کا جامع جواب اس تہذیب اور اس کے نظامِ اقدار کے تناظر میں ہی لیا جا سکتا ہے جس کے سیاق و سباق میں کوئی ادب پارہ تخلیق کیا جاتا ہے۔[۴۲]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکالمہ کی پالیسی یہ ہے کہ جنسی عمل یا عریانی کے بیان کو تہذیب اور اس کے نظامِ اقدار کے تناظر میں دیکھا جائے، اسی نظامِ اقدار کو سلیم اختر نے یوں بیان کیا ہے:

> اپنی انفرادی حیثیت میں کوئی تحریر بھی فحش قرار نہیں دی جا سکتی بلکہ سماجی تحریکات، مذہب، امر و نواہی اور قانونِ تعزیرات کے تناظر میں دیکھنے پر ہی کسی تخلیق کو فحش قرار دیا جاتا ہے۔[۴۳]

چنانچہ مکالمہ نے ادب میں فحاشی کے حوالے سے اپنی پالیسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تخلیقات شائع کی ہیں اور اشاعت سے تاحال ہر دور میں معیاری ادب کی اشاعت کو ممکن بنایا ہے۔

مکالمہ کے اداریوں میں اٹھائے گئے ان سوالات و مسائل پر دلائل کی روشنی میں عقلی بنیادوں پر بحث کی گئی۔ مدیرِ مکالمہ نے حقیقت پسندانہ انداز میں پیچیدہ ملکی سیاسی و سماجی مسائل کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ بحث

بنایا۔ ان اداریوں میں پیش کیے گئے موضوعات و مسائل کے مطالعے سے قاری ان مسائل کو نہ صرف بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے بلکہ ان کے حل کی طرف راہنمائی بھی ملتی ہے۔

۳۔ مکالمہ کے اداریوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل کی پیش کش کا جائزہ:

بیسویں صدی کے اواخر پر جہاں ایک صدی کا سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے وہیں دنیا میں سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا سورج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ سادگی نے جدت کا روپ دھارا۔ اس سائنسی ترقی نے جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی میں انقلاب برپا کیا وہیں ہمیں ذرائع مواصلات کے شعبے میں بھی حیرت انگیز ترقی دکھائی دیتی ہے۔ ذرائع مواصلات بہتر سے بہترین ہوتے چلے گئے۔ ٹی وی کی ایجاد تو پہلے ہی ہو چکی تھی مگر اب ڈش اور سیٹلائٹ کی سہولت بھی گھر گھر میں میسر آنے لگی۔ دنیا کمپیوٹر کے استعمال سے تو واقف تھی مگر انٹرنیٹ اور سائبر نیٹ نے اس ایجاد کو شتر بے مہار بنا دیا۔ اور یوں الیکٹرونک میڈیا کی ترقی کے ساتھ ہی دنیا گلوبل ویلج بن گئی جہاں جغرافیائی دوریاں سمٹ گئیں۔ انسان کو وقت گزاری اور ذوق کی تسکین کے لیے بے انتہا وسائل و ذرائع دستیاب ہو گئے۔ انیسویں صدی کے نصف سے لے کر بیسویں صدی کے اختتام تک سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس نے سماج کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ہر شے پر تبدیلی کا رنگ دکھائی دینے لگا حتیٰ کہ سوچ کے زاویوں اور زندگی کے بارے میں لوگوں کے نقطۂ نظر میں بھی بڑے پیمانے پر تبدیلی نظر آئی۔ نئی نسل میں اسی تبدیلی کا نقشہ کشور وکرم نے یوں کھینچا ہے جس کا مشاہدہ ہم آج کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہماری یہ نسل پرنٹ میڈیا کے زیرِ اثر کم ہو گی اور الیکٹرونک میڈیا کے زیرِ اثر زیادہ۔ اور اس کا نظریۂ حیات اور ادراک و اقدار کا شعور مختلف ہو گا۔ اس کی اپنی دنیا ہو گی اور اپنا کلچر۔ وہ اپنے دور کی تکنیکوں اور الفاظ کے استعمال و ایجاد میں نئے نئے تجربے کرے گا۔[۴۲]

الغرض بیسویں صدی تغیرات کی صدی ہے۔ ان تغیرات نے پاکستان کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس ترقی نے ہمارے ہاں ملکی سطح پر بھی ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا اور اسی صدی کے اختتام پر مکالمہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مکالمہ کا اجراء جس دور میں ہوا وہ سائنسی ترقی کی انتہا کا دور ہے۔

میڈیا کی آزادی بھی اسی جدید سائنسی ترقی کی وجہ سے ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ پاکستان میں ذرائع مواصلات کی ترقی سے جو انقلاب آیا وہ شدید تھا۔ ڈش اور سیٹلائٹ کی آمد سے پہلے پاکستانی میڈیا کسی حد تک خبروں کے نشر کرنے کے حوالے سے حدود و قیود کا پابند تھا۔ چینلز کی تعداد محدود تھی اور ان پر اصول و

قوانین کی پابندی بھی لازم تھی مگر ڈش اور سیٹلائٹ کی آمد سے چینلز کا طوفان آیا اور اس پر مستزاد یہ کہ ۲۰۰۲ء میں مشرف دور میں آزادئ اظہارِ رائے کے نام پر میڈیا کو مکمل آزادی دے دی گئی اور یوں پاکستانی میڈیا ہر حوالے سے آزاد ہو گیا۔ ۲۰۰۲ء میں جنرل مشرف کے دور میں میڈیا کو زبردست ترقی ملی اس دور میں پاکستانی الیکٹرانک میڈیا ایک بلندی تک پہنچا اور سیاسی میدان میں تبدیلی کی نوید سنائی دی۔ نئے قوانین نے الیکٹرانک میڈیا پر حکومتی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ ٹی وی نشریات اور ایف ایم ریڈیو کے لائسنس نجی اداروں کو دے دیے گئے۔ اور یوں میڈیا مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔

عصرِ حاضر میں صرف کیبل، ڈش اور سیٹلائٹ ہی ایسے ہتھیار نہیں جن کا استعمال بے دریغ ہو رہا ہے بلکہ اصل ہتھیار تو اس کے بعد ہمارے ہاں بڑی شدت سے استعمال ہوئے اور وہ ہیں انٹرنیٹ اور سائبر نیٹ۔ پھر سوشل میڈیا کے آنے سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی اور اس پلیٹ فارم پر ہر قسم کے لوگوں کو اپنی بات کے اظہار کا موقع مل گیا۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ:

> پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے علاوہ ایک اور میڈیا ہے کہ جو لوگوں کو آزادئ رائے اور اظہار کی آزادی کے مواقع فراہم کرتا ہے، یہ انٹرنیٹ ہے۔ یہاں وہ مضامین نشر ہو سکتے ہیں کہ جن کے لیے اخبارات میں گنجائش نہیں ہے۔ یہاں بحث و مباحثہ میں آزادی کے ساتھ ان خیالات کا اظہار ہو سکتا ہے کہ جس کے لیے ٹاک شوز میں جگہ نہیں ہے۔[۱۵]

اگرچہ تمام سائنسی ایجادات اور وقت کے ساتھ ساتھ ان ایجادات میں اختراعات وجدت انسانی فائدے اور سہولت کے لیے ہیں مگر چونکہ ہر شے کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ منفی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان ایجادات اور سائنسی ترقی نے بے شمار مسائل کو بھی جنم دیا۔

ادب وقت گزاری کی ایسی سرگرمی ہے جو فکر و نظر کو جلا بخشتی ہے، قاری کے ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ فہم کی دولت سے بھی نواز کر جاتی ہے اور ظاہر کے ساتھ ساتھ فرد کے باطن سے بھی واسطہ رکھتی ہے۔ مگر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے وقت گزاری کے بے شمار، ان گنت وسیلے باآسانی جدید فرد کے ہاتھ میں دے دیے۔ اور یوں ادب اور اس کے فروغ و ترویج کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی راہ میں بے شمار رکاوٹوں کو جنم دیا۔

ادب اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب معاشرے کے جذبات و خیالات، احساسات و واقعات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو میڈیا (پرنٹ و الیکٹرونک) بھی اپنے تئیں یہی فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اور یوں میڈیا بھی معاشرے کا ایک اہم جز بن چکا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ:

> پاکستان کے میڈیا کو معاشرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جائے اور یہ بھی اس کا ایک حصہ ہے اور اس لحاظ سے نہ صرف اس کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کی روایات اور اقدار کو مستحکم کرتا ہے۔[۲۶]

لیکن کیا آج کے دور میڈیا (پرنٹ و الیکٹرونک) اپنا یہ فریضہ بخوبی سرانجام دے رہا ہے؟ اس کا جواب ہمیں میڈیا کے موجودہ کردار سے بخوبی ملتا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی سب سے بڑی تبدیلی ٹیکنالوجی کی ترقی اور عام آدمی تک اس کی رسائی ہے چنانچہ ہمارے ہاں بھی ٹی وی چینلز کی بھرمار اور پرنٹ میڈیا کو ملنے والی آزادی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ادب اور خبر میں فرق ہی قائم نہ رہا۔ میڈیا معاشرے کا عکس ہوتا ہے اور اسی طرح ادب بھی۔ مگر ایک ادیب جب بھی کسی مسئلے یا واقعے کے بیان میں غیر جانب داری اور معروضیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے فکر و تخیل کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو وہ قاری کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن آج میڈیا میں ڈش، سیٹلائٹ، میڈیا کی آزادی اور فراوانی کی وجہ سے اصل بات کو چھپا کر اپنی مرضی اور مطلب کی بات قاری تک پہنچنے لگی۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا جانے لگا اور ناظر یا قاری اسی بات میں الجھا رہتا ہے کہ سچ بالآخر ہے کیا؟ اور یوں وہ ایک قسم کی ذہنی کشمکش کا شکار رہتا ہے اور یہی کشمکش اور بے چینی انسان کی ادب سے دوری کا سبب بنی اور لوگ کتاب سے دور ہونے لگے۔ چنانچہ اس دور میں جب مبین مرزا نے ایک ادبی کتابی سلسلے کا آغاز کیا تو ان کے پیشِ نظر یہ تمام خدشات تھے۔ مکالمہ کی پالیسی ادب کو عصر سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی گزرتے وقت کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی ہے اور اس کے اداریوں میں ہر گزرتے دور کے مسائل کی نشاندہی، ان مسائل کی وجوہات و مضمرات اور ان کے حل کی طرف راہنمائی بھی ملتی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے پاکستانی معاشرے کو کئی انداز سے متاثر کیا اور انقلابی سطح پر تبدیلی کا باعث بنی چونکہ ادب بھی سماج کا جزو ہے اور سماج میں رہ کر ہی تخلیق ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی ان تغیرات کا شکار ہوا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جدید انسان کو وقت گزاری کے جو بے پناہ وسیلے تھما دیے ہیں اس کے پیشِ نظر آج ادب کو درپیش سب سے بڑا مسئلہ اس کی بقا کا ہے۔ اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سائنسی خرافات کی موجودگی میں ادب کی ضرورت کیوں کر ہو؟ اور کیا ان تمام سہولیات کے ہوتے ہوئے ادب میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ وہ ان جدید ہتھیاروں کا مقابلہ کر سکے گا؟

مبین مرزا اِس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ادب کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ

رہا ہے۔ چنانچہ ''ہمارے عہد میں ادب کا موضوع'' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں انہوں نے جدید دور کے اس اہم سوال کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ زیرِ بحث اداریے میں انہوں نے وہ تمام منظر نامہ پیش کیا جس کی وجہ سے آج ادب اس مقام تک پہنچا کہ اس کی بقا بھی ایک سوالیہ نشان بن گئی۔ ادب کے زوال کی ایک وجہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں ہونے والی ان ایجادات کو قرار دیتے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ جدید ذرائع ابلاغ نے میڈیا کی آزادی کے نام پر ایک عجیب و غریب صورتِ حال پیدا کر رکھی ہے۔ جانب داری اور غیر ذمہ داری سے پیش کی گئی خبر کوئی وقعت نہیں رکھتی اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج میڈیا پر جانب داری اور غیر جانب داری کا سوال تو دور کی بات سچ اور جھوٹ کی تفریق بھی ختم ہو چکی ہے__ اور سوشل میڈیا کا غلبہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مدیر مکالمہ لکھتے ہیں کہ:

> الیکٹرونک اور سوشل میڈیا دونوں تفریحِ طبع کا بھی وہ مواقع فراہم کر رہے ہیں کہ بس نہ پوچھیے۔ پورے پورے چینلز انٹرٹینمنٹ کے لیے وقف ہیں جو اپنے ناظرین کو دن رات اور ہفتے کے ساتوں دن مسلسل وہ مواد پیش کرتے رہتے ہیں جو ان کی ضیافتِ طبع کے لیے ہوتا۔ ابھی اس سے بحث نہیں کہ یہ مواد کس معیار کا ہے۔[۶۷]

غرض بیسویں صدی کے اختتام کے ساتھ ہی معاشرتی تغیر شدت سے حالاتِ دنیا میں تبدیلی کا باعث بنا اور ان تمام وجوہات کے پیشِ نظر ٹیکنالوجی کو اپنے استعمال کے لیے صارف تو میسر آ گئے مگر ادب نے اپنا قاری کھو دیا۔ ''گیجٹس کے دور میں ادب'' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں مدیرِ مکالمہ کہتے ہیں کہ:

> ادب آج انسانی زندگی کے حاشیے کی ان اشیاء میں نظر آتا ہے جو ایک ایک کر کے معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔[۶۸]

مبین مرزا نے مکالمہ کے اداریوں میں بارہا ادب کے زوال اور اس کی بقا کے متعلق گفتگو کی جس کا مقصد لکھنے والوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرنا ہے کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے اس کے حل کے لیے فروغِ عمل ہوں۔ اور وہ اس مسئلے کا حل معیاری ادب کی اشاعت کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زمانہ کیسا بھی ہو، ادب ہر دور کی ضرورت رہا ہے۔ جدید رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ معیاری ادب ہر دور میں اپنا مقام پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسا کہ احمد ندیم قاسمی ادب کی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> شعر و ادب تو ٹیکنالوجی کے اس دور میں ذہن کو شاداب، دل کو گداز اور ضمیر کو بیدار رکھنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ اگر کسی قوت نے ٹیکنیکل لحاظ سے ترقی یافتہ انسانوں کو اب تک مشین بننے سے روک رکھا ہے تو یہ شعر و فن اور علم و ادب ہی کی قوت ہے

اور پھر سائنس اور ادب میں بُعد کہاں ہے۔ سائنس کی ترقی تو شاعر اور ادیب کی قوتِ
متخیلہ کا ایک ٹھوس روپ ہے۔[۶۹]

مدیر مکالمہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ بحیثیت قوم اور ایک آزاد ریاست کے شہری ہونے کے ہمیں سائنسی ترقی کی ان ایجادات کے اثرات سے بھی نبرد آزما ہونا ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی لازم ہے۔ انہی خدشات کا اظہار نند کشور وکرم کچھ اس طرح کرتے ہیں:

آج جس سرعت سے ہماری دھرتی سائنس کی نئی نئی ایجادوں اور دریافتوں سے ہمکنار ہے اس نے ہمیں ایک تعمیر و تخریب کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ جس سے ایک طرف تو ہم خوش حالی اور ترقی کی بلندیوں کو چھو سکتے ہیں تو دوسری طرف خطرناک نیوکلیائی ہتھیاروں کی وجہ سے تباہی و بربادی کے اندھیرے بھیانک اور پُر خطر غار کے منہ میں دھکیلے جا سکتے ہیں۔[۷۰]

جدت کے اس دور میں ادب کو اپنے اثر و نفوذ کے لیے زیادہ مشکل چیلنجز کا سامنا ہے۔ لہٰذا ادب کو زمانے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ان تمام چیلنجز سے نمٹنا ضروری ہے۔ اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر آج ہمیں کس قسم کے ادب کی ضرورت ہے مکالمہ کی پالیسی اس حوالے سے واضح نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ مکالمہ کی پالیسی معیاری ادب کی اشاعت ہے۔ جو جدید دور سے ہم آہنگ ہو سکے چنانچہ انہوں نے زمانے کی رفتار کے ساتھ سائنسی ترقی سے پیدا شدہ مسائل کی نشاندہی اپنا فرض سمجھا اور ان کا ممکنہ حل بھی بتایا۔ وہ یہ بات مانتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں ادب کو کئی مسائل درپیش ہیں۔ انہوں نے مکالمہ کے اداریوں میں وقتاً فوقتاً ہر گزرتے دور میں سائنس، ٹیکنالوجی کی ترقی، الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کی آزادی، انٹرنیٹ کے بے دریغ استعمال اور سوشل نیٹ ورکس کے استعمال سے پیدا شدہ مسائل کی نشاندہی اور ملکی و قومی سطح پر ادب پر ان کے اثرات کے حوالے سے درپیش ان مسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے جو ادب کے اثر و نفوذ کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ مکالمہ کی دیگر نگارشات اور مشمولات میں بھی ان مباحث کو اٹھایا گیا۔

ادب کا پہلا فریضہ تہذیب و اقدار کی بقا اور فروغ ہے۔ تہذیب و اقدار صدیوں کے سفر سے بنتی ہیں اسی طرح پاکستانی تہذیب و ثقافت بھی صدیوں کے سفر پر محیط ہے لیکن آج کے اس دور میں صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ آزادہ روی کے نتیجے میں الیکٹرونٹ پرنٹ میڈیا کی بدولت ہماری تہذیبی شناخت گم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم عالمی سطح پر مطابقت کے زعم میں اپنی اقدار سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس مسئلے کو مبین مرزا نے یوں بیان کیا ہے:

ہم اپنے الیکٹرونک میڈیا اور فلم انڈسٹری کو دوسروں کے مقابلے میں لانے کے خواہاں

ہیں سو چینلز، ڈش اور کیبلز کو بھی عام کر رہے ہیں اور پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل ان آلائشوں سے محفوظ رہے۔[۱]

ان وجوہات کی بنا پر ملکی سطح پر تہذیب و اقدار کا ہر شعبہ زوال کا شکار ہونے لگا اور اسی طرح ادب میں بھی زوال کے اثرات دکھائی دینے لگے۔ اور آج عالم یہ ہے کہ عوام ادب اور شاعری سے لاتعلق نظر آتی ہے جیسا کہ شگفتہ یاسمین لکھتی ہیں:

آج کی برق رفتار زندگی اور الیکٹرانک میڈیا کے بڑھتے اثرات، تنوع اور رنگا رنگی نے قاری اور ادب کے رشتے کو محدود کر دیا ہے۔ اگرچہ باذوق قارئین کا ایک ایسا طبقہ ضرور موجود ہے جو پرنٹ میڈیا کی پاسداری اور آبیادی دونوں کر رہا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اردو ادب کے قارئین کی تعداد محدود ہے۔[۲]

ادب کے زوال میں ایک بڑا کردار میڈیا کا بھی ہے۔ ہمارے ہاں ذرائع ابلاغ صرف تفریح اور پروپیگنڈے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج میڈیا ایک با اثر ہتھیار ہے جو عوامی رائے کو بنانے اور بگاڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن صورتِ حال یہ نظر آتی ہے کہ میڈیا ادب کی خدمت میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر ہے حالانکہ اگر میڈیا چاہے تو عوام سے دلچسپی قائم کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ عصرِ حاضر میں ذرائع ابلاغ کی اسی تیز رفتاری اور اثر پذیری نے اہل علم اور اہل قلم کو بہت کچھ سوچنے پر اکسایا ہے۔ ظہیر اختر بیدری ادب اور میڈیا کے تعلق اور میڈیا کی ذمہ داریوں کی بابت یوں لکھتے ہیں کہ:

آج کی دنیا میں الیکٹرانک میڈیا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کی چپے چپے تک رسائی ہے۔ اگر کتاب کلچر کے فروغ میں میڈیا حصہ لے تو ملک کے کونے کونے تک ادب کی رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔[۳]

مکالمہ کے شمارہ ۷ میں انتظار حسین کا ایک مضمون ''عصری ادب کا مسئلہ'' شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے عصرِ حاضر میں ادب کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے ہوئے آج کے دور میں ادب کی قدر دارنی کے سوال کو اٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ادب اپنی قدر دانی کے لیے جس رویے کا تقاضا کرتا ہے اس سے تو پورا پاکستانی معاشرہ محروم ہے۔''[۴]

ادب کی قدر دانی سے محرومی کا مسئلہ تو ہر دور میں رہا ہے، اس مضمون میں انتظار حسین نے عصری ادب کے حوالے سے جس رویے کی نشان دہی کی ہے وہ یہ ہے کہ آج ہمارا میڈیا کمرشل ازم کے زیرِ اثر ہے۔ وہ ہر وہ چیز دکھائے گا جس میں اس کا نفع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا ادیب کی خدمت تو کر رہا ہے مگر ادب کی نہیں۔ ادیب کے

متعلق میڈیا کے رویے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں ادیبوں کی بہت قدر ہوئی ہے۔ ادیبوں کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں، ان کے اعزاز میں تقریبات ہوتی ہیں، جشن منانے کے اہتمام ہوتے ہیں، سات سمندر پار سے بلاوے آتے ہیں، تمغے اور انعامات ملتے ہیں، اخباروں میں ان کے بیانات اور تصویریں شائع ہوتی ہیں، ٹی وی پر انٹرویوز ہوتے ہیں اور ماس میڈیا نے تو پاکستان میں فروغ پانے کے ساتھ ساتھ ادیبوں کو اتنی اہمیت دی ہے کہ وہ شوبزنس کا حصہ بن چکے ہیں۔[۵]

ہمارے ملک میں ادب کے حوالے سے جو میڈیا کا کردار ہے اس کا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ادیب کی قدر تو ہوتی ہے مگر ادب کی نہیں اور ادیب کی قدر بھی محض میڈیا کے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ہمارے ہاں میڈیا پر ادب کے حوالے سے جو کچھ پیش کیا جارہا ہے اس کو دیکھ کر انتظار حسین کہتے ہیں کہ:

> بس یہی کچھ دیکھ کر مجھے گمان ہونے لگا کہ ہمارا زمانہ ادیب کو پروجیکٹ کر رہا ہے اور ادب کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارے زمانے میں ادیبوں کی قدر تو بہت ہو رہی ہے مگر ادب کی قدر جاتی رہی۔[۶]

اس قسم کے مضامین سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ مدیرِ مکالمہ نے ان عصری مباحث کو نا صرف اداریوں میں موضوعِ بحث بنایا ہے بلکہ ان نگارشات کو بھی مکالمہ کا حصہ بنایا ہے جو قارئین کو ان مسائل کی بابت غور و فکر کی عوت دیتی ہیں۔

مدیرِ مکالمہ نے اس مسئلے کے اس رخ کی نشاندہی کی ہے کہ ہمارے ہاں ذرائع ابلاغ نے تفریح کے نام پر پروپیگنڈے کو فروغ دیا ہے اور اس پروپیگنڈے نے جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا ہے وہیں ادب بھی اس کی زد میں آیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج کچھ ادبی نقاد بھی اسی قسم کے پروپیگنڈے کو فروغ دینے میں مصروفِ عمل ہیں اور اس مقصد کے لیے میڈیا کا سہارا لیا ہے جو کہ بامعنی اور معیاری ادب کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔ اس مسئلے کی نشان دہی کر کے وہ دراصل ادیبوں کو یہ پیغام دینا چاہ رہے ہیں کہ تمام تر نظریاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر ادب کے فروغ کے لیے مصروفِ عمل ہوں اور یہی مکالمہ کی پالیسی ہے۔

ہم عہد کے لوگوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ غور و فکر کی عادت ترک کر دی ہے۔ مدیرِ مکالمہ نے اس مسئلے کی نشاندہی کی ہے اور دیگر کئی وجوہات کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی کہ میڈیا کو ہتھیار بنا کر ہمیں تفریحات کے نام پر فضولیات میں الجھایا جارہا ہے اور فکر و عمل سے روکا جارہا ہے اور اس مقصد کے لیے الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا دونوں کا سہارا لیا جارہا ہے۔ میڈیا کے متعلق، جو تفریح کے نام پر ہماری زندگی

میں مکمل طور پر داخل ہو چکا ہے، مدیرِ مکالمہ کی رائے کچھ یوں ہے:

> یہ تفریح نہیں بلکہ فرسٹریشن پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ یہ معاملہ سینما ہاؤسز تک محدود نہیں آپ ٹی وی اور ڈش پہ آنے والے کسی چینل کو لے لیجئے ہر جگہ، یہی کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ حتٰی کہ اخبارات اور رسائل میں بھی خصوصیت کے ساتھ ایسی تصاویر شائع کی جانے لگی ہیں جو آدمی کے وحشیانہ اور بہیمانہ جذبات کو انگیز کرتی ہیں۔ ایک طرف تفریح کا یہ حال ہے تو دوسری طرف آپ اخبارات ورسائل اور ٹی وی چینلز کو لیجیے وہ آپ کو مسلسل ایسی خبریں پہنچانے میں مصروف ہیں جو آدمی کے اعصاب کو شل رکھتی ہیں۔[۵۷]

سائنس کی اس ترقی نے انسان کو جہاں بے شمار آسانیاں دی ہیں وہیں اس کی زندگی میں بے یقینی کی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔ زمانے میں آج جو تیزی دیکھنے میں آ رہی ہے یہ ماضی میں نہ تھی۔ جدید ہتھیاروں کی ایجاد نے زندگی پر انسان کے اعتماد کو کمزور کر دیا ہے، وہ فکر و عمل سے دور ہو گیا ہے کیونکہ اس دور میں وہ اپنی بقا کے تصور سے ہی خوف زدہ ہے۔

مدیرِ مکالمہ اپنے عہد کے باشعور لوگوں کو یہ سوچنے پر اکسا رہے ہیں کہ ہمارے عہد کو آج اس قسم کے مسائل درپیش ہیں لہٰذا ان کے حل کے لیے تدبیر ضروری ہے۔ اس مسئلے کی نشان دہی کر کے مدیرِ مکالمہ نے معاشرے کے باشعور طبقے کو فکر و عمل پر اکسایا ہے کہ وہ دیگر افرادِ معاشرہ کو اس ذہنی کشمکش میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے کوئی لائحہ عمل اختیار کریں اور ادب ہی وہ وسیلہ ہے جو تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ جمالیاتی حس کی تسکین بھی کرتا ہے اور ذہنی آسودگی کا باعث بھی بنتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اگر ہم الیکٹرونک میڈیا کی اس یلغار کو نہیں روک سکتے تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ یہ زندگی کی حقیقتوں کا جو تصور پیش کر رہا ہے ہم اسے قبول نہ کریں۔ اس لڑائی میں ہمارا ادب ایک تہذیبی قوت کا کام کر سکتا ہے۔[۵۸]

مدیرِ مکالمہ نے سائنسی ترقی اور میڈیا کی آزادی کے بموجب پیدا شدہ ایک اور مسئلے کی نشان دہی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس جدت اور نئے ذرائع ابلاغ کی آمد نے ہم سے ہمارے اظہار کی طاقت بھی چھین لی ہے۔ ادب کو جذبات کے اظہار کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ جو لکھنے والے کے گہرے شعور اور احساس کا نتیجہ ہوتا ہے اس کے خیالات کا عملی اظہار ہوتا ہے۔ اور اس کے اردگرد متعلق اس کے تاثرات کا عکاس بھی۔ مگر آج کے اس جدید دور میں ہم صرف وہی دیکھ رہے ہیں جو ہمیں دکھایا جا رہا ہے اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ ہم اس کو دیکھ کر کسی قسم کا اظہار نہیں کر سکتے اور اگر کسی حد تک اظہار کی طاقت رکھتے بھی ہیں تو وہ بھی کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی ہم کیا سوچتے اور

کیا محسوس کرتے ہیں اس بات کی اہمیت ختم ہو چکی ہے اور اس میں سب سے بڑا ہاتھ سوشل میڈیا کا ہے۔ اس مسئلے کی نشان دہی مبین مرزا کچھ یوں کرتے ہیں:

> سوشل میڈیا پر بڑا سا واقعہ بھی محض ایک کلپ یا امیج ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ واقعہ خوش گوار ہے یا اندوہ ناک اور آپ کے اعصاب پر کس طرح اثر انداز ہو گا۔ آپ کا ردعمل اس کے بارے میں پہلے سے طے کر دیا گیا ہے۔[۴۹]

سائنس کی ترقی نے انسان کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کی ظاہری صورت اور اعمال ہی نہیں باطنی کیفیات بھی بدل چکی ہیں۔ مبین مرزا سائنسی ترقی کی اس دنیا کا نقشہ اس طور کھینچتے ہیں:

> مساوی حقیقت پر انحصار اور اسرار کرتی ہوئی یہ دنیا آپ کو صرف گونگے اظہار یا خاموش تصدیق کی دعوت دیتی ہے۔ آپ کے ذاتی احساس یا نجی جذبے کے اظہار کی یہاں کوئی ضرورت یا گنجائش نہیں ہے۔[۵۰]

اس صورتِ حال میں ان جدید ہتھیاروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ادب کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے اور جو چند رسائل اس کام میں حقیقی معنوں میں مگن ہیں ان میں ایک مکالمہ بھی ہے۔ اس کی پالیسی شاعروں و ادیبوں سے یہ توقع رکھنا ہے کہ وہ احساس کے سچے جذبوں سے لبریز ادب کی تخلیق کریں جو حقیقی معنوں میں قلب و ذہن کی بیداری کا باعث بنے۔ مدیرِ مکالمہ نے عہدِ حاضر میں میڈیا کی آزادی کے پیشِ نظر فحاشی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر بھی شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے آتے ہی سائنسی ایجادات اور جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کے ساتھ جہاں طرزِ رہائش میں فرق آیا وہیں طرزِ فکر میں بھی بڑے پیمانے پر تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انسان خود کو زیادہ آزاد خیال تصور کرنے لگا اور یہ آزاد خیالی میڈیا کے ذریعے ہماری زندگیوں میں داخل کی گئی۔ ایک وقت تھا جب ٹی وی چینلوں کی تعداد محدود تھی اور پرائیوٹ چینلوں کا رواج نہ تھا اور سرکاری ٹی وی پر نشر ہونے والا مواد بھی سرکاری سرپرستی میں نشر ہوتا اور فحش یا اخلاق باختہ مواد نشر کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی تفریحِ طبع کے نام پر چینلوں کی بھرمار ہونے لگی، آزاد خیالی کے نام پر عریانیت اور فحاشی کا رواج بڑھتا گیا اور آج میڈیا ایک ایسے کلچر کو فروغ دے رہا ہے جس کا ہماری پاکستانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ دور دور کا ناطہ نہیں۔ مکالمہ کے شمارہ ۱۱ کے اداریہ بعنوان ''ادب، فحاشی اور معاشرہ'' میں مدیرِ مکالمہ نے ماضی اور حال کے ادب کا فرق بھی واضح کیا۔ وہ ادب میں بڑھتے ہوئے فحاشی کے رجحان کا ذمہ دار الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کو قرار دیتے ہیں۔

مدیرِ مکالمہ زیرِ بحث اداریے میں کہتے ہیں کہ ادب میں فحاشی کا موضوع کوئی نیا موضوع نہیں۔ ہر دور اور ہر

تہذیب کے ادب میں یہ مسئلہ موضوع بحث رہا ہے مگر میڈیا کی بے لگام طاقت نے ہمارے تہذیبی تناظر میں فحاشی کا معیار بدل کر رکھ دیا۔ انہوں نے ماضی کے ادب کی مثالیں ہمارے سامنے رکھیں کہ منٹو اور عصمت جیسے افسانہ نگاروں کے وہ افسانے جن پر انہیں مقدمے بھگتنے پڑے اور جرمانے بھرنے پڑے آج اس سے کئی قدر زیادہ مواد ہمیں دیکھنے کو مل رہا ہے اور یہ سب آزادی اظہار رائے کے نام پر دی جانے والی آزادی کا نتیجہ ہے جس نے فحش اور غیر فحش کا فرق مٹا دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> جو کچھ لکھنے پر منٹو اور عصمت نے پیشیاں بھگتیں اور جرمانے بھرے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ فحاشی اب ہمارے اخبارات ورسائل میں عام ہے بلکہ رنگین تصاویر کے ساتھ ہے۔ خبر اخبارات ورسائل تو رہے ایک طرف اس وقت الیکٹرانک میڈیا جو کچھ دکھا رہا ہے وہ تو کسی اور ہی دنیا، کسی الگ ہی معاشرے کا سامان ہے۔ اس کے آگے تو منٹو اور عصمت کی کہانیاں محض بے ضرر اور بچوں کی سی تفریحی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ آج ہم یہ سب کچھ اطمینان سے دیکھ رہے ہیں کسی احتجاج، جھنجھلاہٹ اور خوف کے بغیر۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہی ہُوا ناں کہ ہمارا فحاشی کا تصور یا اخلاقی اقدار کا نظریہ بدل گیا ہے۔[۸۱]

اس تمام صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ میڈیا کے ذریعے انسانی تعصبات کو قابو کر کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دنیا کی حقیقت بھی اب وہ نہیں جو ماضی میں تھی۔ تہذیبوں کی شناخت مٹتی جا رہی ہے۔ غرض سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس ریلے نے ہماری نفسیات کو بھی تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ سائنسی ترقی کے اثرات کے اس پہلو کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے مدیر مکالمہ لکھتے ہیں:

> زندگی کے اسلوب اور انسانی تجربہ و احساس کے سانچے میں بھی نمایاں قسم کی تبدیلی آئی ہے۔ اس تبدیلی کا سرمایہ ٹیکنالوجی میں برپا ہونے والا انقلاب ہے جس نے ایک طرف رسل ورسائل اور نقل وحمل کی دنیا کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے تو دوسری طرف اس کے زیرِ اثر روزمرہ انسانی صورتِ حال میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کا غیر معمولی اثر انسانی سائیکی میں آنے والے تغیر کی صورت میں ظاہر ہوا۔[۸۲]

ہماری نفسیات کی تبدیلی میں جدید میڈیا (الیکٹرانک و پرنٹ) کا بہت عمل دخل ہے۔ جو چیزیں ماضی میں اخلاق باختہ سمجھی جاتی تھیں آج وہ عام ہیں اور ہمارا ذہن و قلب ان کو دیکھ کر کسی قسم کا منفی رد عمل دینے سے گریزاں ہے۔ اسی مسئلے کی طرف نشان دہی سہیل انجم اپنی کتاب میڈیا اور جدید رجحانات میں یوں کرتے ہیں:

> ٹی وی کے پروگراموں کے نتیجے میں سماج میں خطرناک حد تک تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ لوگوں پر ان کے اثرات اس قدر غالب آ رہے ہیں کہ وہ ٹی وی دیکھ کر اپنی پسند اور ناپسند

کوطے کرنے لگے ہیں۔ جو پروگرام ٹین ایج کے لیے ہوتے ہیں اور جن میں ٹین ایجرس ہی کام بھی کرتے ہیں ان میں بھی ایسی چیزیں دکھائی جاتی ہیں جو اس طبقے کے مزاج اور اخلاق پر برا اثر ڈالتی ہیں۔ اگر ہم اس عمر کے لوگوں سے پوچھیں تو بیشتر کو ان میں کوئی برائی نظر نہیں آئے گی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے ذوق کو بگاڑ دیا گیا ہے۔[۸۳]

اس مسئلے کے بیان کے بعد مدیرِ مکالمہ ان اثرات کی وجہ ہماری تہذیب و ثقافت سے دوری کو بیان کرتے ہیں اور یہ دوری سائنس کے کرشمات یعنی الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا کی بے لگام طاقت کے باعث ہے۔

ایجادات واختراع انسانی عقل کے ثبوت ہیں۔ انہی ایجادات کے ذریعے انسان کی آسانی و سہولت اور تفریح و تسکین کے نئے نئے وسیلے ڈھونڈے گئے اور یہی وجہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا باعث بنی۔ تفریح انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔ ٹی وی، انٹرنیٹ، میڈیا، سوشل میڈیا انسان کی آسان معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اس کی وقت گزاری اور تفریح کے ذرائع بھی بنتے گئے اور اس تفریح کے نام پر افراد کی ذہن سازی کا کام کیا گیا۔ اس مسئلے کی بابت مدیرِ مکالمہ کچھ یوں تشویش کا اظہار کرتے ہیں:

کسی کھیل تفریح یا لائٹ موڈ بنانے کا یہ مطالبہ یہاں تک لایا گیا کہ بعد میں آسانی سے اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہونے لگیں جنہیں تہذیب دار معاشرے میں ناشائستہ، بلکہ مخرب الاخلاق سمجھا جاتا تھا۔[۸۴]

یوں سائنس اور ٹیکنالوجی کے یہ ذرائع ہمیں ہماری ملکی و قومی تہذیب و ثقافت سے دور کرنے کا سبب بنتے گئے مگر عصرِ حاضر میں یہ مسئلہ سنگینی اختیار کر چکا ہے اور اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے اپنی تہذیب و ثقافت سے ربط بحال کرنا ہو گا اور اس کام کے لیے ادب کے ذریعے کوشش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مکالمہ کی ادارتی پالیسی بھی یہی ہے کہ ایسا ادب شائع کروایا جائے جو ہماری تہذیب و اقدار کے مطابق ہو اور ان کی مضبوطی کا باعث بنے تبھی ہم اپنی قومی اقدار کو بچا سکتے ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے عفریت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

مدیرِ مکالمہ نے مکالمہ کے اداریوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات کے مختلف پہلوؤں اور ان اثرات سے پیدا شدہ مسائل کا نہایت عمدگی سے جائزہ لیا اور حقائق کو معروضی نقطۂ نظر سے پیش کیا اور خیال انگیز موضوعات کو قارئین کے لیے موضوعِ بحث بنایا۔

حوالہ جات

۱۔ http://sunday.jasarat.com بہ تاریخ ۴/اگست ۲۰۲۰ء، شام ۵:۱۲

۲۔ مسکین حجازی، اداریہ نویسی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۹۔

۳۔ حیدر قریشی، راغب شکیب (مرتبین)، پہلا ورق (کراچی: مکتبہ زبان، جنوری ۱۹۹۰ء)، ص ۱۶۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۵۔ مبین مرزا، "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲ (دسمبر ۱۹۹۷ء): ص ۱۴۔

۶۔ جمیل جالبی، معاصر ادب (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۰۔

۷۔ قرۃ العین، "کیا موجودہ ادب رُو بہ تنزل ہے؟" مشمولہ مکالمہ، ش ۶ (جون تا ستمبر ۲۰۰۰ء): ص ۳۹۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۱۔

۹۔ جمیل جالبی، معاصر ادب، ص ۲۰۔

۱۰۔ مبین مرزا، "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۲ (اگست ۲۰۱۶ء): ص ۸۔

۱۱۔ مبین مرزا، "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳ (جون ۱۹۹۸ تا مارچ ۱۹۹۹ء): ص ۱۴۱۔

۱۲۔ مبین مرزا، "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۵ (اکتوبر ۲۰۱۶ء): ص ۶۔

۱۳۔ جمیل جالبی، معاصر ادب، ص ۲۱۔

۱۴۔ مبین مرزا، "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۴ (اپریل تا اکتوبر ۱۹۹۹ء): ص ۱۲۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۱۶۔ احسن سلیم، "آج کا ادیب اور نئے ادبی رجحانات" مشمولہ روزنامہ جنگ (کراچی: ۲ مئی ۲۰۱۸ء)، ص ۶۔

۱۷۔ مبین مرزا، "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۹ (اگست ۲۰۱۰ء تا دسمبر ۲۰۱۱ء): ص ۱۱۔

۱۸۔ جمیل جالبی، معاصر ادب، ص ۲۰۔

۱۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳۲ (مئی ۲۰۱۷ء): ص ۸۔

۲۰۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۸ (جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء): ص ۱۴۔

۲۱۔ جمیل جالبی، ادب کلچر اور مسائل مرتبہ خاور جمیل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص ۴۷۔
۲۲۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۲ (جنوری تا جون ۲۰۰۴ء): ص ۱۱۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۲۴۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء): ص ۱۳۔
۲۵۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۴ (ستمبر ۲۰۱۶ء): ص ۶۔
۲۶۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۹ (فروری ۲۰۱۷ء): ص ۶۔
۲۷۔ http://www.rekhta.org.articles/pakistan/pakistan-men-urdu-adab-ke.70.saal
بہ تاریخ ۴/ اگست ۲۰۲۰ء، شام ۵:۵۲
۲۸۔ احسن سلیم، "آج کا ادیب اور نئے ادبی رجحانات"، ص ۶۔
۲۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۷ (اکتوبر ۲۰۰۰ تا جون ۲۰۰۱ء): ص ۱۱۔
۳۰۔ حسن عسکری، "ادب، ادیب اور مسائلِ وقت" مشمولہ ساقی (اپریل ۱۹۵۳ء) ص ۱۱۵۔
۳۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۴ (اپریل تا اکتوبر ۱۹۹۹ء): ص ۱۳۔
۳۲۔ جمیل جالبی، ادب کلچر اور مسائل، ص ۵۸۔
۳۳۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۴ (اپریل تا اکتوبر ۱۹۹۹ء): ص ۱۴۔
۳۴۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۳۵۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲ (دسمبر ۱۹۹۷ء): ص ۱۶۔
۳۶۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۶ (جون تا ستمبر ۲۰۰۰ء): ص ۱۲۔
۳۷۔ شمیم حنفی، ادب، ادیب اور معاشرتی تشدد (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جون ۲۰۰۱ء)، ص ۱۶۴۔
۳۸۔ http://www.rekhta.org.ebooks بہ تاریخ ۷/ اگست ۲۰۲۰ء، شام ۱۲:۷
۳۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۴۰ (ستمبر ۲۰۱۸ء): ص ۷۔
۴۰۔ ایضاً، ص ۸۔
۴۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۶ (جون تا ستمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۴۔
۴۲۔ جمیل جالبی، ادب کلچر اور مسائل، ص ۵۸۔

۴۳۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۷ (اکتوبر ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱): ص ۱۲۔

۴۴۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۹ (جولائی یا دسمبر ۲۰۰۲ء): ص ۱۲۔

۴۵۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۲۱ (جنوری ۲۰۱۴ء یا جون ۲۰۰۵ء): ص ۱۵۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۴۷۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۲۳ (جون تا اگست ۲۰۱۶ء): ص ۷۔

۴۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۱۵ (جولائی ۲۰۰۵ء تا جون ۲۰۰۶ء): ص ۸۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۸۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۸۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۸،۹۔

۵۲۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء): ص ۱۶۔

۵۳۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۲۰ (جنوری ۲۰۱۲ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء): ص ۱۳۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۵۵۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۲۷ (دسمبر ۲۰۱۶ء): ص ۶۔

۵۶۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۳۱ (اپریل ۲۰۱۷ء): ص ۶۔

۵۷۔ nlpd.gov.pk/uakhbareurdu/august2011/4html بہ تاریخ ۱۴/ اگست ۲۰۲۰ء، شام ۴:۳۰

۵۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۳۶ (ستمبر ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸ء): ص ۱۳۔

۵۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۱۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۰۔

۶۰۔ اشعر نجمی "اداریہ" مشمولہ سہ ماہی اثبات، خصوصی شمارہ (جنوری ۲۰۱۹ء): ص ۱۶۔

۶۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش۱۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۱۔

۶۲۔ ایضاً ص، ۹، ۱۰۔

۶۳۔ سلیم اختر، "فحاشی کی تعبیریں" مشمولہ سہ ماہی اثبات (جنوری ۲۰۱۹ء): ص ۱۰۱۔

۶۴۔ نند کشور وکرم، "پیش لفظ" مشمولہ مجلہ عالمی اردو ادب دہلی جلد ۲۹ (نومبر ۲۰۰۹ء): ص ۱۱۔

۶۵۔ ڈاکٹر مبارک علی، پاکستانی معاشرہ (لاہور: تاریخ پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۸۷۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۶۷۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳۸ (جولائی ۲۰۱۸ء): ص ۶۔

۶۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳۳ (جون ۲۰۱۷ء): ص ۶۔

۶۹۔ احمد ندیم قاسمی، "ادب اور ادیب" مشمولہ ادبی جائزے مرتبہ خالد اقبال یاسر (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۸۶ء) ص ۳۸۔

۷۰۔ نند کشور وکرم "پیش لفظ" مشمولہ مجلہ عالمی اردو ادب ج ۲۹ (نومبر ۲۰۰۹ء): ص ۱۱۔

۷۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۲۔

۷۲۔ شگفتہ یاسمین، اردو کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء) ص ۲۹۔

۷۳۔ www.express.pk، ادب اور میڈیا، بہ تاریخ ۴/ اگست ۲۰۲۰ء، شام ۵:۱۲

۷۴۔ انتظار حسین، "عصری ادب کا اضطراب" مشمولہ مکالمہ ۷ (اکتوبر ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء): ص ۳۵۔

۷۵۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۷۷۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۸ (جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء): ص ۱۴۔

۷۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۲۔

۷۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۲ (جولائی ۲۰۱۵ء تا مئی ۲۰۱۸ء): ص ۱۰۔

۸۰۔ ایضاً۔

۸۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۲۔

۸۲۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء): ص ۱۲۔

۸۳۔ سہیل انجم، میڈیا اردو اور جدید رجحانات (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۷۹۔

۸۴۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳۲ (مئی ۲۰۱۷ء): ص ۷۔

باب سوم:

مکالمہ کے اداریوں میں بین الاقوامی مسائل کی پیشکش کا جائزہ

باب سوم:

مکالمہ کے اداریوں میں بین الاقوامی مسائل کی پیشکش کا جائزہ

ادب کی کوئی حد نہیں ہوتی لہٰذا اُسے کسی خاص خطے یا ملک تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ادب کا ذکر کرتے ہوئے عالمی سطح پر اس کی مطابقت قائم کیے بغیر بھی چارہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اداریوں میں بین الاقوامی حالات کی روشنی میں خبروں اور واقعات کا بیان بھی ملتا ہے اور عالمی مسائل کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ ان میں ادبی، سیاسی، سماجی اور فکری نوعیت کے موضوعات و مسائل بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔ یہ موضوعات و مسائل محض ملکی صورت حال کی عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ بین الاقوامی و عالمی منظر نامے کو بھی واضح کرتے ہیں۔ لہٰذا ادبی رسائل و جرائد کے اداریوں میں ہمیں عالمی و بین الاقوامی مسائل و معاملات کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔ تاکہ قاری کو ان مسائل پر سوچنے کا موقع ملے اور یوں غور و فکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر انور جمال اپنی کتاب ادبی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

> وہ تحریر جو کسی اخبار یا رسالے کا ایڈیٹر حالات حاضرہ کے سلسلے میں یا کسی ہنگامی اور فوری پیش آمدہ مسئلے پر اس لیے لکھے کہ قارئین ان مسائل پر توجہ دیں اداریہ کے نام سے موسوم ہے۔[1]

قومیں اور ممالک ہمیشہ سے دیگر اقوام و ممالک سے متاثر ہوتی رہی ہیں اور اسی طرح کسی ملک کے مختلف ہائے شعبہ جات بھی دیگر ممالک کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور یوں ادب جیسا شعبہ بھی بین الاقوامی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ادبی رسالے یا جریدے کسی بھی ملک و زبان کے ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور اسی طرح ان رسائل و جرائد کے لیے لکھے گئے اداریوں میں ایسے مباحث کو اٹھایا جاتا ہے جو قاری کو فکر و سوچ پر آمادہ کرتے ہیں اور اسے سوچنے کی دعوت دیتے ہیں گویا اداریوں کی نوعیت فکری مضامین کی سی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مکالمہ کے ہر شمارے کے لیے جو اداریہ سپردِ قلم کیا گیا اور ان میں جن مسائل و مباحث کو اٹھایا گیا وہ بار بار قاری کو کچھ نیا سوچنے پر اکساتے ہیں۔ ادب بذات خود خیال اور سوچ کو لفظوں کا لباس پہنانے کا نام ہے۔ یہ حال سے بھی واسطہ رکھتا ہے اور ماضی اور مستقبل سے بھی صرفِ نظر نہیں کرتا۔ زمانی پابندیوں سے ماورا ہونے کے ساتھ ساتھ آج یہ جغرافیائی پابندیوں سے بھی آزاد نظر آتا ہے اس کی وجہ عصرِ حاضر کی وہ دنیا ہے جو سمٹ کر ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جہاں دنیا کے ممالک دیگر شعبہ ہائے جات میں ایک دوسرے سے ہم

آہنگ ہیں اسی طرح ادب بھی خاص خطے یا علاقے تک محدود نہیں۔ اور آج بھی کسی ایک ملک کا ادب صرف اس ملک کی ملکیت نہیں اور اس طرح ایک ملک کا ادب دوسرے ملک کے ادب سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ مگر بدلتے زمانے کے ساتھ مادی ترقی کی انتہا کے اس دور میں قوموں اور ملکوں کی ایک دوسرے پر اثر پذیری کے ذرائع بھی جدت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اس اثر پذیری نے جہاں دنیا کو کئی طریقوں سے مستفید کیا وہیں کئی جدید قسم کے مسائل کو بھی جنم دیا۔ اردو زبان ادب کی بات کی جائے تو جہاں اردو نے دیگر زبانوں کے ادب کو متاثر کیا وہیں اس سے کہیں زیادہ اردو ادب نے عالمی رجحانات کے اثرات قبول کیے ہیں۔ ادب خود کو عالمی صورتِ حال سے دور نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح اردو ادب نے بھی خود کو کبھی عالمی رویوں سے الگ نہیں رکھا۔ اردو ادب میں مروجہ کئی نظریات، تھیوریز اور رجحانات عالمی ادب کی دَین ہیں۔ یوں ادب کی عالمی اثر پذیری سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ملکی و قومی صورت حال و مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل و معاملات اور عالمی تناظر کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ جدت کے اس دور میں ذرائع ابلاغ کی تیز رفتاری کے سبب معاشروں اور ممالک کی ایک دوسرے پر اثر پذیری زیادہ شدید ہے۔ جیسا کہ پروفیسر سحر انصاری لکھتے ہیں:

> اب گلوبل ویلج اور زمانے کی تیز رفتاری کے زمانے میں کوئی ملک بھی یک و تنہا جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتا ہمارے فکر و دانش کے بیشتر حوالے اور ادب کی زیادہ تر تحریکوں کا تعلق مغرب ہی سے رہا ہے اس لیے ہم نے یا تو انہیں رَد کیا ہے یا قبول کیا ہے۔ بہر حال لاتعلق اور غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔[۲]

ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں یہ اثرات تاخیر سے ظہور پذیر ہوئے تھے مگر زمانے کی ترقی نے جہاں ہر شعبے میں تیزی لائی ہے وہیں ادب کی عالمی و بین الاقوامی اثر پذیری میں بھی تیزی آچکی ہے۔

چونکہ اکیس ویں صدی میں داخل ہوتے ہی ٹیکنالوجی کی انقلابی ترقی کے سبب دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر گئی ہے اور آج تک کسی ایک ملک کے مسائل صرف اس ملک کی جغرافیائی سرحدوں تک محدود نہیں اور ماضی کے مقابلے میں آج کے ہر شعبے میں مسائل کی شدت بڑھ چکی ہے اور ان کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ جیسا کہ نند کشور وکرم لکھتے ہیں کہ:

> گزشتہ صدی جاتے جاتے ہمارے لیے کئی سیاسی، سماجی، فکری ادبی اور ٹیکنالوجی کے پیچیدہ مسائل چھوڑ گئی ہے۔ کیونکہ موجودہ گلوبلائزیشن نے اسے بین الاقوامی بنا دیا ہے اور ہماری سوچ اب ہمارے اپنے ملک تک ہی محدود نہیں رہی اور ہم نا چاہتے ہوئے بھی دنیا کے دیگر ممالک یا خطوں میں وقوعہ پذیر حالات و واقعات سے متاثر ہوتے ہیں۔[۳]

ان سیاسی سماجی، فکری و ادبی مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کے لیے غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے

جیسا کہ مدیر مکالمہ لکھتے ہیں۔

> اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عصر حاضر کے اس عالمی سماج میں انسانی زندگی کا تجربہ جتنا مقامی یا قومی ہے آج اس سے کچھ زیادہ عالمی یا بین الاقوامی ہو گیا ہے۔[۴]

لہٰذا مکالمہ کے اداریوں میں بھی جہاں ہمیں قومی و ملکی سطح پر درپیش مسائل کا بیان ملتا ہے وہیں عالمی سطح پر ادب کو درپیش سیاسی، سماجی، فکری، ادبی اور سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے مسائل کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔ زیرِ بحث باب میں ہم اداریوں کا مطالعہ بین الاقوامی و عالمی مسائل کے تناظر میں کریں گے اور دیکھیں گے کہ مبین مرزا کی ادبی بصیرت ان مسائل کے متعلق کیا نقطہ نظر رکھتی ہے اور اس حوالے سے مکالمہ کی پالیسی کیا ہے؟ زیرِ تحریر باب میں ہم دیکھیں گے کہ مدیر مکالمہ کے نزدیک دنیا کے تمام ممالک کو عالمی سطح پر کن مسائل کا سامنا ہے؟ کون سے ایسے مباحث ہیں جن پر غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لہٰذا باب سوم میں ہم مکالمہ کے اداریوں میں پیش کردہ بین الاقوامی مسائل کو ادبی و فکری، سیاسی و سماجی اور سائنسی منظر نامے کی ذیل میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس حوالے سے مدیر مکالمہ کا نقطہ نظر اور مکالمہ کی پالیسی واضح کی جائے گی۔

۱۔ مکالمہ کے اداریوں میں عالمی ادبی و فکری مسائل کی پیش کش کا جائزہ:

کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے سب سے پہلے اس کی نشاندہی ضروری ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی رسالے یا جریدے کا مدیر ہی وہ پہلا ذریعہ ہوتا ہے جو ادب کی صورتحال پر غور و فکر کر کے مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور پھر قاری کو بھی اپنے ساتھ غور و فکر میں شریک کرتا ہے۔

ادبی رسائل کے اداریوں میں ادب سے متعلق ایسے مباحث کو اٹھایا جاتا ہے جو قاری کے لیے غور و فکر کے نئے در کھولتے ہیں۔ جدید دور نے عالمی سطح پر کئی قسم کے مسائل کو جنم دیا جن پر غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جس طرح ادب کسی خطے یا علاقے تک محدود نہیں ہوتا اسی طرح ادیب بھی کسی جغرافیائی خطے تک قید نہیں ہوتا۔ اور یوں ادب اور ادیب کو درپیش مسائل بھی ہر خطے یا قوم کے لیے ایک جیسے ہیں۔ اور بین الاقوامی اثرات آج جو شدت اختیار کر چکے ہیں ماضی میں یہ عالم نا تھا جیسا کہ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

> معاصر اردو ادب جدید شعور و احساس سے بھرا ہوتا ہے۔ تجربہ پسندی اور بین الاقوامیت کی تیز ہوا جو پہلے پہل ۱۸۹۰ء کے آس پاس محسوس ہوئی تھی، اب ہر طرف بہہ رہی ہے۔ آج اردو ادب میں فکر کی بہت سی لہریں ایک ساتھ جاری و ساری ہیں۔[۵]

مکالمہ کے اداریوں میں ایسے موضوعات و مباحث اٹھائے گئے ہیں جو عالمی سطح پر ادب سے واسطہ رکھتے ہیں۔ مبین مرزا نے مکالمہ کے اداریوں میں ایسے فکر انگیز مسائل کی نشاندہی کی ہے کہ جن کا تعلق ہمارے ملک و

قوم سے ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر پوری دنیا اور دنیا کے مختلف ممالک سے متعلق ہے۔ زیرِ بحث باب میں مکالمہ کے اداریوں کا مطالعہ اس تناظر میں کیا جائے گا کہ ان میں کن بین الاقوامی ادبی و فکری مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

عالمی سطح پر دنیا کی معاشرت بہت بڑی انقلابی تبدیلی کا شکار ہے۔ اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ ہی دنیا کی حالت یکسر بدل گئی۔ جدید دور نے ماضی کی روایات کو بھلا دیا اور جدت کے نام پر بہت کچھ معاشرے میں داخل ہو گیا ہے۔ اور ایسا صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام معاشروں کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی تہذیب و اقدار سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ بدلتی دنیا کے اس اہم فکر انگیز موضوع پر مکالمہ کے شمارہ ۳ کے اداریے میں بحث ملتی ہے۔

تہذیب و تمدن انسان کو ماضی سے وابستہ رکھتے ہیں اور مستقبل کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ادب تہذیب و تمدن اور معاشرے کا اہم شعبہ ہے جو ماضی سے بھی اپنا ربط برقرار رکھتا ہے اور مستقبل کے سوالوں کے جواب بھی تلاش کرتا ہے۔ اور حال سے اس کا واسطہ تو بہر حال موجود رہتا ہی ہے۔ اسی طرح ادب تہذیب و تمدن کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے۔ لیکن عصرِ حاضر کا مسئلہ کم و بیش جو دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں جدت کے زیرِ اثر اپنی تہذیبی شناخت جو کہ صدیوں کے سفر سے بنی تھی۔ کھوتی جا رہی ہیں اور یہ تہذیبی زوال ادب کے شعبے کے زوال کی وجہ سے بھی ہے۔ لہٰذا ادب کا زوال دراصل تہذیب و ثقافت اور اقدار کا زوال ہے۔ اس مسئلے کی نشاندہی مکالمہ کے شمارہ ۳ کے شمارے کے لیے لکھے گئے اداریے بعنوان "ادب اور جدید عہد کی صورت حال" میں کی گئی۔ اور مدیر مکالمہ کے مطابق نا صرف ملکی سطح پر یہ مسئلہ ادب کو درپیش ہے بلکہ یہ ایک عالمی صورتِ حال ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> جب ہم ذرا ٹھنڈے دل سے عالمی صورتِ حال پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ تہذیب و اقدار اور ادب کا یہ نقشہ صرف ہمارے ہاں نہیں ہے بلکہ جس طرف نگاہ کیجیے کچھ ایسی ہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔[۶]

اس وقت ہمارے ادب کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں یہ مسئلہ سب سے سنگین نوعیت کا ہے اور تمام دنیا اس کی لپیٹ میں ہے۔ یہ تہذیبی کشمکش قوموں کی تہذیبی شناخت کے خاتمے کا باعث بن رہی ہے جیسا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> تہذیبی قدروں کا یہ انتشار اور یہ تمدنی کشمکش ہر طرف زور و شور سے جاری ہے اور مظہر ہے زندگی کے دو متضاد تصوروں اور سماجی نظاموں کے اختلاف کا، انسانیت نے صدیوں میں جو قصر و کلیسا یا مٹی کے گھروندے بنائے تھے یا جو روحانی یا خیالی شیش محل کھڑے کیے تھے وہ سب ٹوٹ رہے ہیں۔[۷]

مکالمہ ۱۰ کے شمارے کے لیے لکھے گئے اداریے میں مبین مرزا اس مسئلے کو عہدِ حاضر کے ادب کا سب سے

بڑا مسئلہ قرار دیتے ہیں اور ادب سے وابستہ افراد کو اس بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ مدیر مکالمہ نے اس مسئلے کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ آزادہ روی جو کہ جدید دور کی دَین ہے، نے انسانوں کو ان کی جڑوں سے الگ کر دیا ہے۔ وہ ماضی سے بیگانہ، صرف حال کے سہارے زندہ ہیں اور یوں تمام دنیا ایک بے اقدار معاشرے کا تصور دینے لگی۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> تہذیب و تمدن کے میوزیم میں رکھے ہوئے پروٹوٹائپس جنہیں انسان نے مثالیت پسندی کے فطری جذبے کے تحت تراشا تھا اور جو انسانیت کا گراں قدر سرمایہ تھے اب وہ مٹی کے مادھو ہو کر رہ گئے ہیں۔[۸]

غرض آج کے دور میں جو دنیا ہمارے سامنے ہے وہ جدت کے معاملے میں تو اپنے بزرگوں سے بہت آگے ہے مگر تہذیب و اقدار کے معاملے میں اس کا دامن خالی نظر آتا ہے۔ مدیر مکالمہ جدید دنیا کے اس مسئلے پر تشویش کا شکار نظر آتے ہیں اور اس جدت کے سفر کو ایک سیلاب کی مانند قرار دیتے ہیں جس کے سامنے ادب ایک بند کا کام کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ادیبوں اور دانش وروں سے اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ وہ سنجیدہ ہو کر ادب کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ تخلیق کریں کیونکہ حقیقی معنوں میں لکھا گیا ادب ہی قاری کو فکر و نظر کی روشنی بخش سکتا ہے۔ اور نتیجتاً تہذیب و اقدار کی مضبوطی کا باعث بنتا ہے۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر سید عبدالباری ادیبوں اور دانش وروں کو ان کے مقام و مرتبے سے یوں آگاہ کرتے ہیں:

> اس وقت دانش ور اور قلم کار اگر اپنی تہذیب کی حفاظت اور اپنی اقدار کے دفاع کے لیے شعوری جدوجہد نہیں کرتا تو وہ گویا اپنی تاریخی ذمہ داری سے دامن کش ہو رہا ہے۔[۹]

مدیر مکالمہ بھی ادیب اور ادب کے فروغ کے لیے کام کرنے والے اداروں اور ادبی رسائل و جرائد سے بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے ادب کی اشاعت و فروغ کو یقینی بنائیں جو انسان کا انسانیت اور تہذیب و تمدن پر یقین برقرار رکھ سکے کیونکہ تہذیب و تمدن کی مضبوطی ہی دراصل ادب کی ترقی ہے اور یہی مکالمہ کی پالیسی بھی ہے۔ مکالمہ ۱۰ کے اداریے بعنوان ''عصری حقائق اور ادب'' میں وہ اس ساری صورت حال کا حل کچھ یوں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں:

> اس ہم عصر حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو ادب کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے اس اہم ترین مسئلے اور اس کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے اپنی تہذیب اور اس کی اقدار پر اپنے لوگوں کا اعتبار قائم رکھنے میں معاون ہو۔ اس احساس کو برقرار رکھے کہ تہذیبی اور اخلاقی اقدار قوم کے تصورِ حیات اور ان کے مجموعی داخلی مطالبات سے وضع ہوتی ہے۔[۱۰]

باب دوم میں ملکی مسائل کے بیان میں مدیر مکالمہ کے بیان کردہ ایک اہم ادبی مسئلہ کا جائزہ لیا گیا جو کہ قومی سطح پر ادب کا زوال ہے۔ اور ان کے مطابق یہ مسئلہ صرف ملکی مسئلہ نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی یہی صورتِ حال درپیش ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب ہم ادب کے زوال کی بات کرتے ہیں تو اس سے کیا مراد لیتے ہیں۔ کیا ادب کی مقدار میں کمی ادب کا زوال ہے۔ یا اس کے معیار میں کمی کو اس کا زوال قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا تسلی بخش جواب مبین مرزا مکالمہ ۱۴ کے شمارے میں لکھے گئے اداریے بعنوان "نیا زمانہ، ادب کا زوال اور ہم" میں یوں دیتے ہیں:

> "ماجرا اصل میں یہ ہے کہ ادب کے زوال سے مراد ہے پوری ایک تہذیب اس کی پیدا کردہ طرزِ احساس اور انسانی اعمال اور تعلقات کی صورت میں ظاہر ہونے والے ذہنی و فکری رجحانات کا زوال۔"[۱۱]

زیرِ بحث اداریے میں مدیر مکالمہ نے اس اہم عصری مسئلے پر سوچنے کی دعوت دی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ زمانے کی ترقی مادیت کی ترقی اور تہذیب کے زوال پر منتج ہو رہی ہے۔ اخلاقی روایات اور اقدار کا دامن سکڑتا جا رہا ہے۔ ادب تہذیب کا صورت گر ہوتا ہے۔ تہذیبی اقدار کا زوال ادب کا زوال جب کہ تہذیب و تمدن کی ترقی ادبی ترقی کا باعث بنتی ہے۔ اور عہدِ حاضر میں ادب حقیقی معنوں میں روبہ زوال دکھائی دیتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں کہ؛ سوال یہ ہے کہ عہدِ حاضر کی قدروں کو پرکھا جائے تو تہذیب عالم میں آرٹ اور ادب کا مقام کیا رہ جاتا ہے؟[۱۲]

گویا عہدِ حاضر میں ادب اپنا مقام کھوتا جا رہا ہے۔ عہد جدید اور اس کے رجحانات نے ہمارے ہاں ادب کو جس انداز سے متاثر کیا اس کا جائزہ گزشتہ باب میں ملکی مسائل کی ذیل میں لیا جا چکا ہے۔ مقام حیرت یہ ہے کہ یہ صرف ہمارا مسئلہ نہیں بلکہ عالمی صورت حال ہے اور بظاہر دنیا کی بڑی ریاستوں اور پہلی دنیا کے ممالک میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ عہدِ حاضر کے اس عالمی مسئلے کی نشاندہی ڈاکٹر عبدالمغنی یوں کرتے ہیں۔

> "آج ادب کا توازن برہم ہو چکا ہے۔ مغرب میں بھی مشرق میں بھی، چنانچہ ادب کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جس سے زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔"[۱۳]

جدید دور میں ادب کے زوال کی مختلف صورتیں سامنے آئی ہیں جو یہ منظر پیش کرتی ہیں کہ حقیقتاً جدید دنیا کا جدید انسان ادب سے دوری اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ادب کے زوال کی سب سے عام صورت قاری کی ادب میں دلچسپی میں کمی ہے۔ ماضی میں جو علمی و ادبی ماحول میسر تھا حال میں دنیا کے کسی خطے کے کسی معاشرے میں ایسا ماحول دکھائی نہیں دیتا۔ دیگر مصروفیات اور مشاغل کے سبب ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی ماند پڑتی جا رہی ہے۔ عالمی منظر نامے پر

بھی غور کیا جائے تو یہی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے۔

مدیر مکالمہ نے جدید دور کے اس اہم مسئلے کو بھی مکالمہ کے اداریوں میں موضوع بحث بنایا ہے اور مکالمہ ۱۶ کے شمارے کا اداریہ اس اہم موضوع پر بحث کرتا ہے۔ جس کا عنوان "نیا زمانہ، ادب کا زوال اور ہم" ہے۔ زیرِ بحث اداریے میں اس تمام صورتِ حال کی منظر کشی کی گئی جو ہمارے ہاں ملکی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر ادب کی صورت حال ہے۔ اکیسویں صدی کی تیز رفتاری نے جہاں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی رفتار کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ وہیں اس کے اثرات نے ادب کی رفتار کو سست کر دیا ہے اور یہ اثرات جدید انسان کی ادب سے عدم دلچسپی ادبی سرگرمیوں کی قلت، کتابوں سے محبت میں کمی اور ادبی رسائل کی محدود اشاعت میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

زیرِ بحث اداریے میں مدیر مکالمہ نے اس مسئلے کو اجاگر کیا اور اس مسئلے کو عصرِ حاضر کی سب سے بڑی حقیقت قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کیا جانا چاہیے کہ گزشتہ تین دہائیوں میں پڑھنے لکھنے کے رجحان میں کمی واقع ہوئی ہے۔ نتیجتاً کتابوں کی اشاعت متاثر ہوئی، ادبی رسائل کا حلقہ سمٹا، وہ جو سنجیدہ ادبی ہفتہ وار نشستیں ہوا کرتی تھیں ان میں بھی کمی نظر آئی ہے۔ یہ باتیں درست ہیں کہ اس نئی دنیا اور نئے عہد میں یہ سب کچھ صرف ہمارے یہاں نہیں ہوا ہے ہم تو تیسری دنیا کے باسی ہیں۔ اگر جہانِ اول کو دیکھیں تو وہاں بھی کچھ اس کے مماثل ہی صورت حال سامنے آتی ہے۔[۱۴]

اس مسئلے کو شمارہ ۲۱ کے اداریے بعنوان "اکیسویں صدی میں ادب اور قاری کا رشتہ" میں ایک بار پھر موضوع بحث بنایا گیا اور ادب کے زوال کے مسئلے کو عہدِ حاضر کا اہم مسئلہ قرار دیا گیا۔ عہدِ حاضر کی تبدیلیوں اور متغیر رجحانات نے عالمی سطح پر ادب کو متاثر کیا ہے۔ یہاں ان تبدیلیوں کو ہم اپنے ملک میں دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔ وہیں انہیں عالمی سطح پر بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اور ادب کا زوال اور مائل بہ تنزل ہوتا ہوا رجحان بھی ایک عالمی مسئلہ ہے۔ جس کی نشاندہی وہ یوں کرتے ہیں:

> اس وقت یہ بات بین الاقوامی امر واقعہ کے طور پر تسلیم کرلی گئی ہے کہ گزشتہ تین چار دہائیوں میں ادب کے مطالعے کے رجحان میں بہ تدریج کمی واقع ہوئی ہے۔[۱۵]

اسی اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے عالمی سطح کے اس مسئلے کے اسباب بھی بیان کیے ہیں ان کا ملکی سطح پر اسباب سے موازنہ کیا۔ عالمی سطح پر ادب کے زوال کی بنیادی وجہ ذرائع مواصلات کی ترقی ہے۔ پرنٹ میڈیا کی بجائے الیکٹرونک میڈیا کا استعمال ہونے لگا جس نے نہ صرف معاشرے میں کتاب پڑھنے کی روایت کو ختم کر دیا بلکہ ہر فرد بشمول ادیب وقت گزاری کے بے تحاشا استعمال نے ادب کی ضرورت کو ختم کر دیا ہے اور یوں لوگ ادب سے دور

ہوتے جارہے ہیں۔

نئے زمانے کی مادیت پرستی کے رجحان نے ادب کی تخلیق کے لیے درکار احساس و شعور کو بھی انسانی زندگی سے محو کر دیا ہے۔ ہر انسان مادیت پسندی کا شکار ہے اور ادب اور ادیب بھی ان اثرات کی زد میں ہیں اور ادبی زوال کا یہ عمل ایک عالمی مسئلہ ہے۔ جسے گزشتہ صدی میں ہی ریاض صدیقی نے بھی محسوس کیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج یہ مسئلہ شدت اختیار کر چکا ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> بیسویں صدی کی اس آٹھویں دہائی میں تخلیقی ادب اور تصور آفرینی کا عمل مغرب ترقی یافتہ سماجوں میں بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادبی و علمی اقدار کے بکھراؤ اور ادبی رسائل و تقاریب کے لیے توجہ کا فقدان ایسے مظاہر ہیں جن کو یہاں کی طرح انگلستان اور فرانس میں بھی محسوس کیا جارہا ہے۔[۱۶]

ادب کے زوال میں میڈیا کا اہم کردار ہے میڈیا کے ذریعے سوچ کو جامد اور محدود کیا جارہا ہے اور تفریح کے نام پر فحاشی کو فروغ دیا جارہا ہے۔ آج کا انسان جب غور و فکر ہی نہیں کرے گا تو ادب جیسی سرگرمی جس کی بنیاد ہی غور و فکر اور احساس و تخیل پر ہے، کو فروغ کیسے دے سکے گا جیسا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> فلم ریڈیو اور اخبار وغیرہ تفریح کے زیادہ ارزاں اور مقبول ذرائع ہیں یہ جدید انسان تفریح کی خاطر ذہن پر بار ڈالنے کا قائل نہیں۔[۱۷]

زیرِ بحث اداریے میں مدیر مکالمہ نے جو اہم نکتہ اٹھایا ہے اور جس پر آج کے دور کے ادیب کو سوچنے کی ضرورت ہے وہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں خود ادیب کا رویہ ہے۔ مدیر مکالمہ لکھتے ہیں کہ معاشرے کے عام افراد جو ایک طرف ادیب اور شاعر حضرات بھی ان اثرات کی زد میں ہیں وہ بھی ان تفریحات و آسائشات کا عادی ہوتا جا رہا ہے اور نئے زمانے کے اثرات نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ تو ایسے میں ادب کی ضرورت کا سوال پیدا ہوتا ہے جسے وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

> کیا معاشرہ اور اس کے افراد تفریح اور آسائش کو چھوڑ کر کسی ادب جیسی قدرے سنجیدہ اور ذہنی سرگرمی کی طرف مائل ہوں گے؟[۱۸]

یہ تو ادب لکھنے والوں کا حال ہے مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے ایک ادیب یا شاعر کو لکھنے پر آمادہ کرنے والا ایک عامل قاری بھی ہے جو کہ اب ادیب کو میسر نہیں رہا یا بہت حد تک کم ہو چکا ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں ادب کے تنزل کے اثرات دکھائی دے رہے ہیں۔ ادب کے مقام و مرتبے میں کمی اور اس کے پڑھنے کے رجحان میں کمی کو دنیا کے تمام معاشروں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں ادب کی ضرورت پر بھی سوال اٹھتا ہے اور اگر ادب کو قاری میسر نا ہو تو ادب کی تخلیق بھی ایک سوال بن جاتی ہے۔ اس صورت حال کو مبین مرزا یوں بیان کرتے ہیں:

یہاں ایک اور سوال توجہ طلب ہے آج جب کہ یہ بات مشرق و مغرب کی سب تہذیبوں اور سماجوں میں نا صرف بار بار کی جا رہی ہے بلکہ خاصے لوگ اس پر آمنا و صدقا بھی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اب ادب نہیں پڑھا جا رہا یا یہ کہ ادب کسی کو ادب کی ضرورت نہیں ہے۔ ادیب و شاعر لوگ کس امید پر اور کب تک حرف و صوت کا چراغ جلائیں گے۔[۱۹]

جدید دور کے انسان کے لیے زندگی کا مفہوم بھی کافی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ ہر شے کو مادی ترازو میں تولنے کا عادی ہو چکا ہے۔ ادب کا تعلق تو فنون لطیفہ کے اس شعبے سے ہے جو غور و فکر کی بنیاد پر قائم ہے اور فکر و احساس سے پروان چڑھتا ہے۔ ایک ادیب کے لیے ارد گرد کے حالات و واقعات اس کی تحریروں کے لیے خام مال کا کام کرتے ہیں وہ معاشرے اس کے افراد اور ارد گرد کے حالات و واقعات اور مسائل و معاملات کو ادیب کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنی سوچ کے در وا کر کے حالات و واقعات سے اپنی تخلیق کے لیے مواد حاصل کرتا ہے اور پھر اسے تخیل کی آنچ پر پکا کر خوب صورت فن میں ڈھالتا اور قاری کے سامنے لاتا ہے۔ گویا یہ فکر، احساس اور شعور ہی ادبی تخلیق کی بنیاد ہے۔ لیکن عصرِ حاضر کے انسان کی زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے اثرات یوں دکھائی دیتے ہیں کہ آج کے جدید انسان نے غور و فکر اور سوچنے کی عادت ترک کر ڈالی ہے اور صرف ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطے میں یہی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے۔ مکالمہ ۳۲ کے شمارے میں مدیر مکالمہ اس مسئلے کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

موجودہ عہد میں ادبی و علمی، بلکہ ساری ذہنی سرگرمیوں میں عوامی دل چسپی کم ہوئی ہے تاہم یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جانی چاہیے کہ عوامی مزاج میں بھی تبدیلی صرف ہمارے یہاں نہیں آئی بلکہ یہ ایک گلوبل فینومینا ہے۔ اس کا مشاہدہ عالمی سطح پر دنیا کے مختلف ملکوں میں بآسانی کیا جا سکتا ہے۔[۲۰]

"ہم اگر زندہ ہیں" کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں بھی مصنف نے اس مسئلے کی بابت غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کہ اس جدید دور میں حقیقی طور پر توجہ طلب ہے اور اس پر غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ غور و فکر کی عادت میں کمی اور احساس کی قلت فرد کو دوسروں سے بیگانہ اور اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کر رہی ہے اور یہ صورت مشرق و مغرب دونوں طرف برابر دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ یہ صورت حال ماضی میں بھی تھی مگر اب اس رویے میں شدت آتی جا رہی ہے اور شدت کی طرف جاتا یہ رویہ ہمیں اس کے تدارک کے لیے عملی اقدامات کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ عہد جدید کے اس مسئلے پر مبین مرزا کچھ اس طرح اظہار تشویش کرتے دکھائی دیتے ہیں:

فرد کی بیگانی کا تو بہت چرچارہ چکا ہے۔ ادب میں بھی اور تنقید میں بھی۔ مغرب میں بھی اور مغرب کے زیرِ اثر ہمارے یہاں بھی۔ تو اب یار لوگ کہیں گے کہ میں وہی پرانے راگ الاپنے بیٹھ گیا ہوں۔ خیر ان کے جی میں جو آئے سو کہیں، میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ ہمارے افراد معاشرہ میں بیگانی کا رویہ بڑھتا جارہا ہے۔[۲۱]

ایک زمانہ تھا کہ ادب کو تفریح اور فارغ وقت کی سرگرمی کے طور پر زندگی کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا جو کہ وقت گزاری کا وسیلہ تو تھا ہی مگر ساتھ ہی سوچنے اور غور و فکر کا سامان بھی مہیا کرتا تھا۔ فہم و عقل کی روشنی اور فکر و نظر کی بالیدگی بھی عطا کرتا تھا اور ادیب کی سوچ جو کہ دراصل ارد گرد کی صورت کا تجزیہ ہوتی ہے اپنے ساتھ قاری کو بھی غور و فکر اور آگہی کے سفر میں شریک کرتی تھی۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ جدید دور کی تبدیلیوں نے انسان کو وقت گزاری کے مختلف وسیلے تھما دیے۔ اور ان ذرائعوں کے ذریعے انسان کے وقت کو بے مصرف بنایا جانے لگا۔ اور اس تمام صورت حال کا یہ نتیجہ نکلا کہ انسان غور و فکر کی عادت سے دور ہوتا گیا۔ اور یہ مسئلہ صرف کم ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ممالک کا ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ممالک اس جدید عہد میں ادب کی دوری اور ادب کے زوال کا شکار ہیں۔ اگرچہ یہ صورتِ حال کچھ ممالک میں زیادہ سنگین ہے اور کچھ میں اس کی شدت کم ہے مگر بہر حال یہ مسئلہ دنیا کے تمام ممالک کے ادب کو درپیش ہے۔ تفریح کے جدید تصور نے انسانی زندگی کو جس جس طرح متاثر کیا اور اس سے جو نتائج ادب کو بھگتنے پڑے، اور اس عالمی سطح پر ادب میں جو نئے مسائل در آئے، اس کی نشان دہی مدیرِ مکالمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

نتیجہ یہ کہ وہ سب سرگرمیاں جو ذہن و اعصاب کے لیے مسکن دوا کا کام نہیں کرتیں بلکہ بیداری کا سبب بنتی ہیں معاشرے میں ان کا رجحان بہت کم ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا کم زور، کم تعلیم یافتہ، پس ماندہ، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ سب ہی اقوام میں اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی سطح پر ہوا ہے۔[۲۲]

تفریح کا یہ جدید تصور دراصل طاقت ور اقتداری قوتوں کی محکوم قوتوں کی ذہنی تسخیر کا ایک ذریعہ ہے۔ مدیرِ مکالمہ نے جدید انسان کی اس جامد سوچ کے پیچھے جو عوامل بیان کیے ہیں وہ اسے سپر پاور کی گیم بتاتے ہیں جو لوگوں کو تفریحات میں الجھا کر فکر و عمل سے اور سوچنے سے باز رکھنے کی کاوشوں میں مصروف ہے۔ مدیرِ مکالمہ جدید انسان کی اس فکری بے حسی اور احساس و شعور کی دولت سے محرومی کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

یہ سپر پاور کی گیم ہے اور اس لیے ہے کہ آپ کی سوچ کو محدود تر رکھا جائے، آپ کے سوچنے کے انداز اور موضوعات کو determine کیا جائے، آپ کو وہ سب سمجھنے اور سوچنے سے باز رکھا جائے جو وہ نہیں چاہتے کہ آپ سوچیں اور سمجھیں۔[۲۳]

اس مسئلے کو بارہا مکالمہ کے اداریوں میں اٹھایا گیا، اور قاری سمیت ادب سے وابستہ ہر فرد اور ادارے کو اس پر غور و فکر کی دعوت دی گئی مکالمہ ۳۲ کے شمارے میں وہ ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ یہ دراصل سامراجی طاقتوں کی کارستانی ہے جو صارفیت کی ترقی اور اپنی معاشی برتری و کنٹرول کے حصول کے لیے ذہنوں کو اپنی ڈگر اور اپنے ارادوں کے مطابق چلانے کی منصوبہ بندی ہے۔ چنانچہ جن جن ممالک میں ان ہتھکنڈوں کے زیرِ اثر آ کر ادب اپنا مقام و مرتبہ کھوتا جارہا ہے اسے مدیرِ مکالمہ نے سامراجیت کی کامیابی قرار دیا ہے۔

رسائل و جرائد کے اداریے ادب کے مسائل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور ادب اور ادیب کے لیے راہنمائی کا کام بھی کرتے ہیں اور مکالمہ میں بارہا ہمیں ادیب کو موضوع بحث بناتے ہوئے اور اس کی راہنمائی کرتے ہوئے اداریے ملتے ہیں۔ ادیب کی راہنمائی اس کے مثبت منفی رویوں کی نشاندہی دراصل ادب کی خدمت ہے اور یہ ہمیں مکالمہ میں بخوبی نظر آتی ہے۔

مکالمہ ۲۳ (مئی ۲۰۱۷ء) کے شمارے کے لیے ''ہم ادیب شاعر لوگ'' کے عنوان سے اداریہ سپردِ قلم کیا گیا۔ جس میں اسی مسئلے پر بحث کے تسلسل کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن زیرِ بحث اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے ادب میں زوال کے عالمی مسئلے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ادیب کے حالیہ رویوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ادب کے زوال کے مسئلے کی تمام صورتوں کی نشاندہی، اس کی وجوہات و اثرات بیان کرتے ہوئے زیرِ بحث اداریے میں انہوں نے ادب کے شعبے کے اہم کردار یعنی ادیب کی کڑی سرزنش کی اور بلاواسطہ اسے تمام صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دیا وہ لکھتے ہیں کہ:

> جب معاشرے کے تہذیبی اور اخلاقی رویوں میں بگاڑ پیدا ہو رہا تھا اس وقت ادیب شاعر کہاں تھے؟ وہ لو آتے ہوئے وقت کے قدموں کی چاپ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کیوں نا دیکھا کہ ہوائیں رخ بدلتی ہیں، زمانہ قباحت کی چال چلتا ہے۔ اگر وہ یہ سب دیکھتے اور سمجھتے تھے تو چپ کیوں تھے؟[۲۴]

مدیرِ مکالمہ نے دورِ حاضر میں ادب سے وابستہ غیر سنجیدہ افراد کو ان کی خامیوں سے آگاہ کیا ہے اور انہیں یہ احساس دلایا کہ مادیت پرستی اور مفاد پرستی ان کے مقام و مرتبے کے خلاف ہے۔ اور ادیب کے اسی حالیہ رویے کو عالمی سطح پر بھی ادب کے زوال کی سب سے بڑی وجہ قرار دیا ہے۔

عہدِ حاضر کا ایک اہم مسئلہ جو دنیا کے ہر خطے کے ادب کو درپیش ہے وہ کسی خاص اور نمایاں ادبی تحریک کی کمی کا مسئلہ ہے۔ ادب اور ادیب کے زوال پر تو مندرجہ بالا سطور میں بات ہو چکی ہے۔ اور اسی زوال کا جو آخر نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آج بین الاقوامی سطح پر بھی دنیا کے کسی خطے کے ادب میں کوئی نئی تحریک پنپتی دکھائی نہیں

دیتی۔ ادبی سرگرمیاں ماند پڑتی جارہی ہیں کیوں کہ سماج میں ادب اور ادیب کی ضرورت کو اہم نہیں سمجھا جارہا۔ اس مسئلے کو مکالمہ کے اداریوں میں یوں بیان کیا گیا:

> اب ادب اور ادیب سماجی منظر نامے کے مرکز میں نہیں رہے وہ حاشیے پر آچکے ہیں۔ خیال رہے یہ صورت صرف ہمارے یہاں نہیں ہے بلکہ اس وقت یہ ایک گلوبل فینومینا ہے۔[۲۵]

زیرِ بحث اداریے میں ادب میں کسی نئی تحریک کے فقدان کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے مدیرِ مکالمہ نے ادب سے وابستہ افراد کے اس رویے کی بھی نشاندہی کی ہے جو بظاہر ادب کی خدمت میں مصروفِ عمل ہیں مگر درحقیقت یہ دکھاوے سے زیادہ کچھ نہیں۔

لہٰذا اِس تمام صورتِ حال کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ آج تہذیب و معاشرت کا ہر شعبہ بشمول ادب روبہ زوال ہے۔ اور یہی دورِ حاضر کا عالمی منظر نامہ ہے۔ اس ساری صورتِ حال کو واضح کرنے کے بعد مدیرِ مکالمہ ہرگز مایوسی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ وہ ادب سے وابستہ افراد سے (جو حقیقی معنوں میں ادب کی خدمت میں مصروفِ عمل ہیں) پر امید ہیں کہ وہ ادب کے ذریعے جدید دور اور اس کے نئے حربوں کا مقابلہ کریں گے۔ اور ادب کو تہذیبی اقدار کا آئینہ دار بنانے کا عمل جاری رکھیں گے اور یہی مکالمہ کی پالیسی بھی ہے۔

مکالمہ کے شمارہ ۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء) میں مبین مرزا نے ایک پر مغز سوال اٹھایا جو کہ نہ صرف ملکی سطح پر توجہ طلب ہے بلکہ دنیا کے ہر خطے کے ادب کے لیے یہ ایک مرکزی خیال سوال ہے کہ ادیب کس نظریے یا فکر کی بنیاد پر اپنی وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ طرزِ معاشرت ہر دور میں بدلتا رہتا ہے اور ہر دور میں ادب کو نئے سوالات و مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ادیب کی وابستگی کا سوال ہر دور اور ہر خطے میں ہمیشہ توجہ طلب رہا ہے۔ اور اسی سوال کو زیرِ بحث اداریے میں اداریہ بعنوان 'ادب میں وفاداری' میں موضوعِ بحث بنایا گیا جو کہ مدیرِ مکالمہ کے مطابق مشرق و مغرب ہر دو جگہ میں عرصے سے توجہ طلب ہے۔ مدیرِ مکالمہ نے اس سوال کا جواب جدید تناظر میں پیش کیا۔ ان کے مطابق ہر دور و ہر خطے کا ادیب اپنے عہد کی حقیقتوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ لہٰذا آج کے ادیب کا سروکار بھی عصری، تہذیبی، سیاسی، معاشی و معاشرتی صورتِ حال سے ہے۔ اس عصری صورتِ حال کو زیرِ بحث اداریے میں تفصیل سے واضح کیا گیا۔

مدیرِ مکالمہ کے نزدیک جدید عہد کی حقیقت وہ تہذیبی عدم توازن ہے جو آج کے دور کا المیہ ہے۔ عالمگیریت کا جانب بڑھتی ہوئی یہ دنیا، ٹیکنالوجی کا انقلاب اور اس کے جدید انسان پر اثرات، تہذیبوں کی ختم ہوتی شناخت اور تہذیبی اقدار کا زوال اس نئے دور کی حقیقتیں ہیں۔ وہ آج کے دور کے ادیب سے متعلق اس ضروری سوال کے جواب میں یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اسے اپنے سماج اور اس کے اقداری نظام سے اپنا ربط استوار کرنا ہوگا

اور اسی سلسلے میں وہ ادیب کی راہنمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> انسانیت اوراس کے آدرشوں سے اس کی وفاداری بے شک اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے تو اصل میں اسے اپنے عہد اور سماج کے انسانی رویوں اور تہذیبی رجحانات کی فکر کرنی ہے۔[۲۶]

جدید عہد کے انسان کے رویے عہدِ ماضی کے انسانی رویوں سے یکسر مختلف ہیں۔ ترقی یافتہ قرار دی جانے والی اس دنیا میں آج عالم یہ ہے کہ ہر شے جھوٹ کے پردے میں چھپی ہے۔ ہر ذی روح حقیقت سے بے خبر ہے یا اسے کسی مقصد کے تحت حقیقت سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ عہدِ جدید کے اس مسئلے پر غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے اور 'مکالمہ' کے اداریوں میں ہمیں فکری مسائل و موضوعات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی طرح اس مسئلے پر بھی ہمیں مکالمہ کے شمارہ ۲۳ کے اداریے میں بحث ملتی ہے۔ اور اس حوالے سے مسئلے کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ آج کے دور میں ادب اور ادیب کے کردار کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> اس عہد کا ایک اور بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آج بہت سی آوازوں نے بہروپ بھر لیے ہیں۔ بدصورتی آج جس کے لہجے میں بول رہی ہے، جھوٹ کو دیکھئے تو سچ کی آواز لیے ہوئے ہے اور سر کا تکلم سراسر خیر کے انداز میں ہے۔[۲۷]

دورِ حاضر کی ترقی اور سماجی تبدیلی نے انسان کے رویوں میں جو تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان کے اثرات کچھ یوں دکھائی دیتے ہیں کہ آج کا انسان مخمصے کا شکار اور فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم نظر آتا ہے۔ وہ سچ اور جھوٹ میں فرق قائم کرنے سے قاصر ہے۔ اس مسئلے کو مکالمہ کے ۳۶ویں شمارے میں ایک بار پھر موضوع بحث بنایا گیا اور اسے عہد جدید کی صورت حال کا ایک پیچیدہ مسئلہ قرار دیا۔ اس مسئلے کے حل میں ادیب کا کردار زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ادب کا کام ہی سچائی کا پرچار ہے اور ادب فنونِ لطیفہ کا وہ شعبہ ہے جو سراسر سچائی سے بحث کرتا ہے اور جھوٹ اور منافقت سے اس کا کچھ ربط نہیں۔ ادیب کی آواز معاشرے کے ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی لکھتے ہیں:

> ادب کا بنیادی عنصر سچائی ہے ادب کیونکہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اس طرح ادب کے ذریعے ہمارے سامنے زندگی کی تمام تر حقیقتیں اور سچائیاں ہوتی ہیں۔ سچائی ایک بہترین معاشرے کی بنیاد ہے اس لیے ادب براہِ راست ایک بہترین معاشرے کی بنیادوں کو مستحکم کرتا ہے۔[۲۸]

لہٰذا مدیرِ مکالمہ بھی اس اخلاقی زوال اور تہذیبی تنزل کے حل کی ذمہ داری ادیب کے کندھوں پر ڈالتے ہیں اور وہ اس سے اس کے مثبت کردار کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہی مکالمہ کی پالیسی ہے۔

۲۔مکالمہ کے اداریوں میں عالمی سیاسی و سماجی مسائل کی پیش کش کا جائزہ:

ادب و سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سیاست معاشرے کا ایک اہم شعبہ ہے۔ جو فرد کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یوں اجتماعی طور پر پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ ادب پر بھی سیاست کے اثرات کافی مضبوط رہے ہیں جن کا مطالعہ ہم گزشتہ باب میں ملکی سیاست کے تناظر میں کر چکے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ملکی و عالمی ہر دو سطح پر سیاست کے میدان میں تبدیلی و تغیر کے اثرات ادب پر ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ گویا ادب سیاست سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ یہ اثر مثبت انداز میں بھی ہو سکتا ہے اور منفی انداز میں بھی۔

کسی بھی ملک میں اس کی سیاست کا شعبہ دیگر شعبہ جات پر اپنا اثر ڈالتا ہے اور اس دورِ جدید میں کسی بھی ملک کی سیاسی صورتِ حال دنیا کے دیگر ممالک کی سیاست کے زیرِ اثر دکھائی دیتی ہے۔ یعنی دنیا کا کوئی بھی ملک بین الاقوامی سیاسی اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ اب چونکہ ملکی سطح پر سیاست معاشرے کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی اپنا اثر ڈالتی ہے تو یقینی طور پر عالمی سیاست بھی دیگر ممالک کی سیاست کے ساتھ ساتھ اس کے ادب کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ عالمگیریت کے اس دور میں معاشروں کی ایک دوسرے پر اثر اندازی کافی مضبوط ہے۔ لہٰذا آج کے ادب کو بھی صرف ملکی سیاسی و سماجی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سماجی و سیاسی مناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ مکالمہ نے ادب کے دائرہ کار کی وسعت کو سمجھتے ہوئے اسے صرف ملکی سطح پر ہی اہمیت نہیں دی بلکہ عالمی ادب کے ساتھ ربط و تعلق بھی قائم کیا۔ مکالمہ کے اداریوں میں ہمیں عالمی سیاسی صورت حال کا بیان بھی ملتا ہے۔ زیرِ تحریر باب میں مکالمہ کے اداریوں کا مطالعہ بین الاقوامی سیاسی مسائل کے بیان کے تناظر میں کیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ دورِ حاضر میں بین الاقوامی سیاسی و سماجی کون سے ہیں؟ اور ان کے ادب پر اثرات کس نوعیت کے ہیں؟

کسی عہد کے معاشرتی، تہذیبی، سیاسی و سماجی حوالے نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا ادب پر عالمی اثرات کے باعث کسی بھی عہد کے ادب کا مطالعہ عالمی سیاست و معاشرت کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ ماضی میں دنیا کے ممالک ایک دوسرے پر اس طرح اثر انداز نا ہوتے تھے جیسے آج ہیں۔ جدید دور نے جہاں ایک طرف معاشرے میں آسانی کے ذرائع کی دریافت کا کام کیا وہیں جدت کے اس سفر میں بیشتر مسائل سے بھی دوچار ہوا۔

> جدید دور اپنے تمام تر کمپلیکیشنز، ذہنی پیچیدگیوں اور الجھاوے لے کر ابھرا۔ عالمی سطح پر مشینی نظام کی حکومت لامحدود صنعتی ترقی، مہلک ہتھیاروں کی ایجاد، عمرانی اور سیاسی مسائل اور اقتصادی استحصال نے سماج کی ہیبت بدل کر رکھ دی ہے۔[۲۹]

لہٰذا ادب کے وہ تمام سماجی و سیاسی مسائل جو عالمی سیاست و معاشرت کے اثرات سے پیدا ہوتے ہیں کی

نشاندہی، ان پر غور و فکر اور ان کے حل کی طرف اقدامات وقت کی اہم ضرورت ہے۔

دنیا میں جو بھی معاشرتی و سیاسی واقعات پیش آتے ہیں ایک تخلیق کار ان سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ادیب معاشرے کا حساس ترین نمائندہ ہوتا ہے جو مسائل کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور ان کے حل کی طرف راہنمائی بھی جیسا کہ مبین مرزا لکھتے ہیں:

> جب ہم کسی عہد اور کسی معاشرے کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس عہد اور معاشرے کا سماجی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی منظر نامہ کسی نا کسی زاویے اور عنوان سے اس مطالعے میں از خود شامل ہو جاتا ہے۔[۳۰]

ہر واقعہ یا موضوع جو اس کی نظر میں قابل ذکر ہوتا ہے، کو الفاظ کا روپ دے کر قاری کے سامنے لاتا ہے اور اسے بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ معاشرتی و سماجی برائیوں کی نشاندہی اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس کا یہ سیاسی و سماجی شعور صرف ملکی سطح تک محدود نہیں ہوتا بلکہ بین الاقوامی عالمی سطح پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ مبین مرزا لکھتے ہیں:

> ظلم چاہے کسی پر بھی ہو اور جو بھی کرے، ادیب اس کے خلاف اپنا ردعمل ریکارڈ کراتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ظلم کرنے والا کس نظریے یا عقیدے اور آئیڈیالوجی سے تعلق رکھتا ہے اور مظلوم کا تعلق کس سے ہے وہ تو انسانوں کے استحصال اور انسانیت کی تذلیل کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔[۳۱]

ادیب عالمی سیاسی حالات و واقعات سے بے خبر نہیں رہتا بلکہ ان سے متاثر ہوتا ہے اور نا صرف ذاتی شعور رکھتا ہے بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے یہ شعور قاری کو بھی منتقل کرتا ہے اور وہ تمام واقعات جو سماجی ناہمواریوں کا سبب بنتے ہیں ان کے خلاف آواز بھی بلند کرتا ہے اور ادیب یہ سب کسی خاص مقصد کے تحت نہیں بلکہ لاشعوری طور پر کرتا ہے۔ اردو ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ملکی سطح پر پیش آنے والے سماجی و سیاسی واقعات نے ادب کو ہر دور میں متاثر کیا ہے۔ ہجرت کے واقعے کا بیان اردو ادب کا اہم موضوع رہا ہے تو اس کے ساتھ ہی سقوط ڈھاکا کا واقعہ بھی ادب کا موضوع بنا اور ہر صنف ادب میں اس کی عکاسی کی گئی۔ آمریت کے دور کے واقعات ہوں یا حالیہ دہشت گردی غرض ہر دور کے سماجی و سیاسی واقعات اردو ادب کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ اور اسی طرح عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات نے بھی اردو ادب کو شدت کے ساتھ متاثر کیا اور اردو ادب ملکی حدود سے ماورا ہو کر عالمی سطح سے ہم آہنگ نظر آیا۔ مثلاً ۹/۱۱ کا واقعہ، امریکہ و افغانستان کی جنگ، کشمیر کا مسئلہ، عراق و ایران کی لڑائی غرض ہر عالمی سیاسی و سماجی واقعے کی بازگشت اردو ادب میں سنائی دی گویا عالمی منظر نامے میں ہونے والی تبدیلیاں ادب کو ہر صورت متاثر کرتی ہیں۔ جیسا کہ مبین مرزا لکھتے ہیں:

> امریکا کی پہلے افغانستان اور پھر عراق کے خلاف وحشیانہ کاروائیوں کے بعد جب دنیا بھر

> کے باضمیر اور باشعور ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا
> کہ وہ امریکا کے اس اقدام کی پرزور مذمت کرتے ہوئے اس سے اپنی فکری اور نظریاتی
> لاتعلقی اور مظلوم انسانوں کے ساتھ اپنے تعلق یعنی (جانب داری) کا اظہار کریں۔[۳۲]

مکالمہ کے اداریوں میں ہمیں اس عالمی سیاسی صورت حال کا بیان بھی ملتا ہے۔ مبین مرزا نے دورِ حاضر کے عالمی منظر نامے میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے ادب پر اثرات کو اپنے اداریوں میں موضوع بحث بنایا اور ادب کو عالمی سطح پر کن مسائل کا سامنا ہے اس کی نشاندہی بھی کی ہے۔

عالمی سیاسی منظر نامے پر غور کیا جائے تو عالمی سیاست کے دو بڑے مراکز امریکہ اور روس دکھائی دیتے ہیں جو دنیا کے دیگر ممالک پر اپنا کنٹرول رکھنے کے خواہش مند ہیں بلکہ کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہیں۔ دنیا کے دیگر ممالک ان دو عالمی طاقتوں سے متاثر نظر آتے ہیں اور اسی طرح ان ممالک کی سیاست بھی ان عالمی طاقتوں کی سیاست کے تابع نظر آتی ہے۔

گویا یہ دنیا اہل سیاست کے قبضے میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ عالمی صورتِ حال ہے کہ معاشرت دیگر شعبہ جات کے مقابلے میں سیاست سے زیادہ مغلوب نظر آتی ہے۔ سیاسی حکمران ملکی سطح پر ہر شعبہ زندگی پر اپنی اجارہ داری قائم کیے ہوئے ہیں اور کچھ عالمی طاقتیں اپنے ممالک کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر کمزور اور پسماندہ ممالک کو بھی اپنی طاقت کے بل بوتے پر کنٹرول کیے ہوئے ہیں۔ گویا جدید دور کا انسان سیاست کے تابع ہے۔ اس بات کا حوالہ انہوں نے مکالمہ ۲۰ کے شمارے کے اداریے بعنوان "ادب اور قیامِ امن" میں دیا جس میں انہوں نے ٹامسن جان کے بیان کا یہ حوالہ دیا کہ انہوں نے پون صدی قبل ہی عہد جدید کے انسان کی بابت یہ اطلاع دے ڈالی تھی کہ ان کی تقدیر سیاسی اصطلاحوں میں لکھی جائے گی اور ان کی اس بات پر اعتراض کرنے والوں کو مدیرِ مکالمہ یوں جواب دیتے ہیں:

> اس لیے کہ عہدِ جدید کے انسان کی زندگی پر سیاست نے اپنا تسلط اس طرح قائم کیا ہے
> کہ اب اس کے سیاہ و سپید کا اختیار نمایاں حد تک اسی کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ اب اس
> عہد کے انسان کا نوشتہ تقدیر اسی کے ہاتھوں اور اسی کے الفاظ یا احکامات کے ساتھ
> سامنے آئے گا۔[۳۳]

مبین مرزا نے عالمی سیاسی صورتِ حال کے حوالے سے یہ نقطہ نظر پیش کیا کہ موجودہ دنیا پر اہلِ سیاست کا قبضہ ہے۔ چنانچہ معاشرے کے دیگر شعبے بھی اس سے متاثر ہیں اور یوں ادب کا شعبہ بھی اس سے متاثر ہے۔ سیاست سے پیار اور اقتدار کی ہوس ہر ذی روح کا مطمع نظر بن چکا ہے اور جو لوگ اہل سیاست سے متاثر دکھائی دیتے ہیں بد قسمتی سے ان میں چند ادیب بھی شامل ہیں اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال شدت اختیار کرتی جا

رہی ہے اور یہ کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں بلکہ عالمی صورتِ حال یہ ہے کہ ملکوں پر سیاسی حکمرانوں کی اجارہ داری ہے۔ اور عالم یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں ادب کے شعبے کو بھی حکومتی و ریاستی سطح پر کنٹرول کرنے کی کوششیں کی جار ہی ہیں۔ ادب کو نئے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی کاوشیں نظر آتی ہیں جیسا کہ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

> لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اردو کا ادیب آج تمام دنیا کی اس صورت حال کا حصہ ہے جس میں ریاستی اقتدار (جو کبھی کبھی بھیس بدل کر قوم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے) چاہتا ہے کہ ہر شخص پنہاں اور واضح دونوں انداز سے اس کی خواہشات کے آگے سر خم کرے۔ تمام دنیا کے صاحبِ اقتدار طبقے ادیبوں کو اپنے حصولِ مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔[۳۴]

سیاست سے پیار اور اقتدار کی ہوس نے ادب کے مقام کو کم کر دیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے جن معاشروں میں ادب سیاست کے زیرِ اثر آگیا وہاں یہ زوال آمادہ ہو گیا۔ مدیرِ مکالمہ نے شمارہ ۴ کے اداریے بعنوان ''ادیب، سیاست اور معاشرہ'' میں اس مسئلے کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے۔ ''موجودہ دنیا پر اہلِ سیاست کا غلبہ ہے یہ زمانہ ہی اہلِ سیاست کا ہے۔''[35]

زیرِ بحث اداریے میں مدیرِ مکالمہ لکھتے ہیں کہ عالمی سطح پر دنیا کے تمام ممالک میں جہاں معاشرتی روایات سیاست کے تابع ہیں، ادیب اپنے کام یعنی ادب کی خدمت سے بے بہرہ ہو گیا ہے اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر ادیب آج اپنے مقام سے غافل ہے تو اس کی وجہ جدید زمانے کی بدلتی قدریں، قومی و نسلی امتیاز اور طبقاتی کشمکش ہے اور انہی تبدیل ہوتی قدروں نے ادیب کے معاشرتی مقام و مرتبے کو کم کر دیا ہے اور صرف صاحب اقتدار طبقے کی پوجا شروع کر دی۔ صاحبِ اقتدار اور اہلِ سیاست کی سماجی تکریم نے ادیبوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا اور یہ صورتِ حال آج کے دور کی ہے۔ جبکہ ماضی میں صورتِ حال ایسی نہ تھی۔ مدیرِ مکالمہ ماضی میں اہلِ علم و اہلِ قلم لوگوں کے متعلق معاشرتی رویے کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> زمانے اور معاشرے اپنے اہلِ علم اور اہلِ دانش سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ ان کے فکر و خیال اور آراء کو اہمیت دی جاتی تھی۔[۳۶]

ادیب معاشرے کا حصہ ہے۔ وہ معاشرے کو متاثر کرتا بھی ہے اور اس سے متاثر ہوتا بھی ہے۔ تمام دنیا کا عالم یہ ہے کہ وہاں سیاست کو ہی غالب طاقت قرار دیا گیا ہے۔ مادیت پسندی نے مفاد پرستی کو فروغ دیا اور یوں صورت حال یہ ہے کہ مقتدر لوگ سیاست سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ اور ہر بات میں مادی مفادات کے خواہاں ہیں۔ اسی رویے نے جہاں معاشرے کے دیگر شعبہ جات کو متاثر کیا وہیں ادب کا شعبہ جو کہ تہذیب و اقدار کا پاسبان سمجھا جاتا ہے، پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ اس صورتِ حال کو مبین مرزا یوں بیان کرتے ہیں:

> اہلِ سیاست چونکہ اہلِ اقتدار ہیں اس لیے عوام الناس نے براہِ راست ان سے متاثر ہو کر ان کی راہ اختیار کی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے کا اختصاص اور شناخت ایک ناختم ہونے والی مادی دوڑ بن گئی ہے۔ اب کامیابی کا نشان یہ ہے کہ جو اس دوڑ میں جتنا آگے ہو گا اتنا ہی بڑا، قابلِ تعظیم اور کامیاب قرار پائے گا۔[۳۷]

اس طرح دنیا کی موجودہ سیاسی صورتِ حال نے ادب کو اجتماعی سطح پر زوال کا شکار کر ڈالا ہے۔ مدیرِ مکالمہ ادب کی عالمی سطح پر بقا کے لیے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ادیب کو خود کو سیاست سے دور رکھنا ہو گا۔ اسے اپنے مقام و مرتبے سے آگاہ ہوتے ہوئے خود کو اپنے کام سے مخلص رکھنا ہو گا۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ: قوموں کی شکست و ریخت کے زمانے میں ادب ہی وہ سپاہی ہے جو سب سے آخر میں ہتھیار ڈالتا ہے۔[۳۸]

اہلِ اقتدار اور اہلِ سیاست کا مطمع نظر طاقت کا حصول ہے۔ آج کے دور کی صورت حال کچھ یوں ہے کہ دنیا کا ہر ملک طاقت کے حصول کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کا خواہش مند ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اسلحہ اور ہتھیاروں کے حصول کی جنگ جاری ہے۔ سیاسی طور پر طاقت اور ممالک ہمیشہ کی طاقت اور اقتدار کی اجارہ داری کے متمنی ہیں اور دیکھا جائے تو اکثر ممالک اس مقصد میں کامیاب ہوتے بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ کئی ممالک ایٹمی طاقت بن چکے ہیں اور مزید مضبوطی اور طاقت کے مسلسل ہتھیاروں کی خرید و فروخت میں مصروفِ عمل ہیں۔ اور نہ صرف اسلحہ بلکہ دیگر ذرائع کے ذریعے بھی دوسرے کمزور ممالک کو فتح کرنے کے حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

طاقت و قوت کا حصول عصرِ حاضر کا رجحان تو نہیں بلکہ یہ تو ازل سے جاری و ساری ہے۔ طاقت کے زور پر کمزور کا استحصال تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے لیکن عصرِ حاضر میں اس رجحان نے شدت پکڑ لی ہے اور اس مقصد کو نئے اور جدید طریقوں سے پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور اس رجحان کے اثرات بھی جدید انداز سے عصرِ حاضر کے انسان کو متاثر کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری رقمطراز ہیں:

> زمانے نے تیزی سے کروٹ لی اور بیسویں صدی نے ہنگامہ و آتش اور تعمیر و تخریب کا وہ صور پھونکا کہ انسانیت کے کان سُن اور اوسان گم ہو گئے اس کی صدائے بازگشت نئی موسیقی کی شور آفرینی، نئی مصوری کی ابہام پسندی اور نئے ادب کی پریشان نگاری میں ظاہر ہوتی ہے۔[۳۹]

طاقت کے اس جدید تصور نے عام انسان کو خوف اور وحشت میں مبتلا کر دیا ہے۔ جہاں اسے ہر دم اپنی ذات کی بے یقینی کا خوف لاحق رہتا ہے۔ اور یہ کسی ایک خطے کے انسان کا مسئلہ نہیں بلکہ عالمی صورتِ حال ہے۔ دنیا کے تمام معاشرے خوف و وحشت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ مدیرِ مکالمہ نے جدید دور کے سماج کے اس مسئلے کو اپنے

اداریوں میں موضوع بحث بنایا اور اس کی وجہ مقتدر قوتوں کے طاقت و قوت کے حصول کی خواہش بتائی۔ اس مسئلے کی نشان دہی وہ یوں کرتے ہیں: "تشدد کی یہ لہر پوری نئی دنیا اور جدید انسان کی تقدیر معلوم ہوتی ہے۔"[۴۰]

معاشرے کی یہ کیفیت سیاست کی کاری گری ہے اور اس کے زیرِ اثر ہے یہ متشدد رویے اور متشدد صورتِ حال ایک عالمی مسئلہ ہے۔ آج کا انسان جس قدر جدید کہلاتا ہے وہ اسی قدر اپنی ذات اور ماحول سے خوف زدہ ہے۔ اور مدیرِ مکالمہ اس کی وجہ مقتدر ممالک کا طاقت کے حصول کے لیے اسلحہ کی دوڑ کا حصہ بننا، دنیا میں تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی کثرت اور ان کا خوف بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> تعمیری اور تخریبی قوتیں ہمیشہ سے دنیا میں رہی ہیں لیکن بربریت کی لہر نئے انسانوں میں جو خوف کا احساس اب پیدا کیا ہے اس کی نظیر اس سے پہلے کی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی۔[۴۱]

اس ساری صورتِ حال کے بیان کے بعد مدیرِ مکالمہ ادب کے مقام و مرتبے کو بیان کرتے ہیں کہ اب ادب عصر حاضر کے سماجی و سیاسی صورتِ حال سے مطابقت قائم کرتے ہوئے انسانی سوچ کو تہذیبی فکر سے ہم آہنگ کرے اسی صورت میں جدید انسان کو اس معاشرتی خوف کے عارضے سے رہائی دلائی جاسکتی ہے۔

عصری حقائق اور ادب" کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں جو کہ جنوری تا جون ۲۰۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوا مصنف نے ایک پر مغز سوال اٹھایا کہ عالمی سطح پر ہمارے عہد میں ادب کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟

مختلف مفکرین کے نزدیک ادب کے بنیادی سوال کے مسئلے کے متعلق جو خدشات اٹھائے ان میں ادب کا زوال، ادب کی قدر دانی کا مسئلہ، جدید دور میں ادب کی ضرورت و اہمیت اور اس کی بقا کے سوالات شامل ہیں۔ جبکہ مدیرِ مکالمہ نے عصر حاضر میں سب سے بڑا انسانی مسئلہ تہذیبی زوال اور تہذیبی تصادم بتایا ہے۔ کسی بھی عہد کا ادب اس کی سماجی و سیاسی صورتِ حال سے آنکھیں نہیں چراتا ادب کے مطالعے میں اس معاشرے یا عہد کی اخلاقی، تہذیبی، سیاسی و سماجی حالات کی بازگشت ضرور سنائی دیتی ہے۔ مگر آج کے دور میں یہی اخلاقی تہذیبی اقدار کا زوال ہی اس دور کا اہم مسئلہ ہے۔ جیسا کہ مدیرِ مکالمہ لکھتے ہیں کہ:

> ہمارے عہد کا سب سے بڑا انسانی مسئلہ یہ ہے کہ اقوام اور معاشروں کی تہذیبیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں، ایک پر دوسری کے سائے اس طرح منڈلا رہے ہیں کہ ان کے انفرادی جوہر اور اخلاقی و اقداری نظام، تعطل کی کیفیت اور معرضِ تشکیک میں ہیں۔[۴۲]

اس عہدِ جدید میں یہ طاقت و قوت اور جنگ و جدل کی نئی صورت ہے کہ جس میں اقتدار کے حصول کے خواہش مند ممالک جغرافیائی سرحدوں پر قبضہ کرنے کی بجائے تہذیبوں کا خاتمہ چاہتے ہیں اور ایسے معاشرے کے قیام کے خواہاں ہیں جہاں کوئی قوم اپنی الگ تہذیبی شناخت برقرار نا رکھ سکے۔ اور یہ صورتِ حال حقیقی معنوں میں

قابلِ تشویش ہے اسی مسئلے کی نشاندہی جمیل جالبی کچھ یوں کرتے ہیں:

> تہذیبی سطح پر ہر طرف سے پسپا کر دینے والے حملے ہو رہے ہیں اور اہم ان سے بے خبر ہیں۔ تہذیبی سطح پر ہماری غفلت اور بے پرواہی کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اگر ہمارے ملک کے جغرافیائی حدود پر کوئی دشمن حملہ کر دے اور ایک گز زمین پر بھی قابض ہو جائے تو ہمیں فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے ملک کی سرحدوں پر حملہ ہو گیا ہے اور ہم دشمن سے اس زمین کو حاصل کرنے میں ہماری قوت صرف کر دیتے ہیں لیکن جب یہی حملہ ہماری تہذیبی سرحدوں پر ہوتا ہے تو ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور نہ ہمیں کسی چیز کے چھننے کا احساس ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس پر جتنی تشویش کا اظہار کیا جائے کم ہے۔[۴۳]

آج کے دور کی یہ صورت کسی ایک ملک یا قوم کا مسئلہ نہیں بلکہ عالمی صورتِ حال ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں معاشرتی و تہذیبی قدریں ایک عرصے سے تبدیل ہو چکی ہیں اور وہاں اس تہذیبی زوال کے اثرات نمایاں ہیں جبکہ ہمارے ہاں بھی کہیں تقلید اور کہیں مغرب کے زیرِ اثر ان نئی قدروں کو اختیار کیا جارہا ہے اور ظاہری سطح پر یہ تبدیلی واضح انداز سے نظر آرہی ہے۔ مکالمہ میں اس مسئلے کی یوں نشان دہی کی گئی:

> آج یہ مسئلہ کسی ایک قوم یا معاشرے کا نہیں ہے بلکہ بلا اختصاص تمام اقوام و ملل اس سے دوچار ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دنیا کی تہذیبی تاریخ میں یہ مسئلہ اپنی نوعیت میں بالکل نیا اور نہایت گنجلک ہے۔[۴۴]

مدیرِ مکالمہ نے اس بے اقدار معاشرے کے قیام کے اثرات کے متعلق جو پیش گوئی کی ہے وہ یہ ہے کہ مادیت پرستی کے اس سماج کی تشکیل کے بعد فکر و نظر کو جلا اور روح و باطن کی تسکین کیوں کر حاصل ہو پائے گی؟ چنانچہ وہ دورِ جدید کے ان مسائل کا حل ایسے ادب کی اشاعت قرار دیتے ہیں جو تہذیب و تمدن کا صورت گر ہو اور تہذیب و اقدار پر انسان کے یقین کو مضبوط کر سکے۔ دنیا میں مادیت پرستی کا رجحان روحانی مسرت اور روحانی مطالبات کی پرواسے قاصر ہے۔ لہٰذا وہ ادب سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تہذیب و اقدار کی بقا و فروغ کے لیے اپنا کردار ادا کرے جیسا کہ احسن سلیم لکھتے ہیں:

> دنیا بھر کے انسانوں سے ہم آہنگی کا شعور پیدا کرنے کے لیے تخلیقی جدوجہد کو شعار بنانے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے مباحث کو ترک کر کے ادب برائے تبدیلی کو شعوری سطح پر اجاگر کرنا، روحِ عصر یعنی اسپرٹ آف ایج کا تقاضا ہے۔[۴۵]

اظہارِ رائے کی بے لگام آزادی جدید دور کا ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔ جس کا ذکر "جدید دنیا بوٹ اور ادب"

کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں کیا گیا۔ سماجی قدریں ہر لمحہ بدلتی رہتی ہیں اچھی بری اقدار معاشرے میں پنپتی گھٹتی رہتی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ اظہارِ رائے پر پابندی سماجی جبر کہلاتا تھا۔ انسان نے ترقی کے نام پر معاشرے میں جو تبدیلیاں لائیں ان میں ایک اظہارِ رائے کی آزادی کا حق حاصل کرنا بھی ہے۔ اور آج آزادی اظہارِ رائے کے نام پر ہر اچھی و بری بات کے کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی جارہی۔ زیرِ بحث اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے اس حق کے استعمال کا جو رخ دکھایا ہے وہ عہدِ حاضر کا ایک اہم سماجی مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ اظہار رائے کی آزادی ایک حد تک مناسب ہوتی ہے مگر جب حقوق کی آزادی کے نام پر اظہار کی قوت کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو معاشرے کی قدروں پر کاری ضرب لگتی ہے۔ اس مسئلے کو مدیرِ مکالمہ نے یوں قاری کے سامنے پیش کیا:

> رینے ساں کے بعد سے یورپ کے سماجی مزاج میں جو اہم تبدیلیاں آئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہاں ہر موضوع پر گفتگو کی آزادی کا تصور رائج ہو گیا۔ اس سے کسی کو غرض نا رہی کہ دیکھے آیا تو موضوع قابلِ غور ہے بھی کہ نہیں، یا کہ سماج پر اس کے اثرات منفی ہوں گے کہ مثبت۔ بس اظہار کی آزادی کا تصور قبول کر لیا گیا۔[۴۶]

مختلف شعبوں میں اس حق کے غلط استعمال کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی اس کا استعمال معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ لہٰذا جدید دور کے اس اہم سماجی مسئلہ پر غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مدیرِ مکالمہ نے مکالمہ کے لیے بھی یہی پالیسی اپنائی کہ اگرچہ یہ مختلف الخیال لوگوں کے لیے اظہارِ رائے کا ایک پلیٹ فارم ہے مگر وہ اس حق کو توازن سے استعمال کرنے کے قائل ہیں اور یہی مکالمہ کی پالیسی ہے۔

مکالمہ کے شمارہ ۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء) میں لکھے گئے اداریے میں مبین مرزا نے ادیب کی وفاداری اور وابستگی کے سوال کو اٹھایا تو عہدِ جدید میں اس سوال کے جواب کی تلاش کے سلسلے میں پہلے اس جدید عہد کا نقشہ قاری کے سامنے پیش کیا تاکہ ماضی اور حال میں اس سوال کی نوعیت واضح ہو سکے۔ اسی تناظر میں مدیرِ مکالمہ نے جدید دور کے سماج کی جو صورتِ حال ہمارے سامنے واضح کی وہ آج کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ حال کی سیاست ماضی کی سیاست سے یکسر مختلف ہے۔ دنیا بظاہر تو مہذب ہونے کی دعویدار ہے مگر حقیقتاً اندرونِ خانہ طاقت اور اقتدار کا نشہ اور اس کے حصول کے لیے کی جانے والی کاوشیں ماضی کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ مدیرِ مکالمہ کی بصیرت دنیا کی جو صورتِ حال دیکھ رہی ہے وہ یہ ہے کہ آج دنیا میں طاقت کے حصول کا مطلب حربی قوت کے ساتھ ساتھ اقتصادی غلبہ حاصل کرنا بھی ہے۔ اس صورتِ حال کا نقشہ وہ یوں کھینچتے ہیں:

> آج ہم یک قطبی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں طاقت کے توازن کا تصور مفقود ہے اسی لیے کہ اقتصادی سیاسی اور حربی اعتبار سے ایک غالب قوت یا مقتدرہ اپنی منشا اور

مفادات کے تحت اس دنیا کی نظام سازی کر رہی ہے ہم دیکھ رہے ہیں یہ نظام بڑی حد
تک دنیا کے مختلف خطوں میں روبہ عمل ہے۔[۴۷]

عہدِ جدید کی اس سیاسی و سماجی صورتِ حال نے جدید دور کے فرد کے رویوں اور مزاج کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے اور ادیب بھی اسی سیاست کے زیرِ اثر تشکیل شدہ معاشرے کے حصہ ہے اور ادب اور سماج کا تعلق تو ہمیشہ سے قائم ہے۔ ادیب عصری تناظر سے علیحدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر دور اور ہر خطے کا ادیب اپنی سماجی وفاداری و وابستگی کا اظہار کرتا ہے اس بات کی دلیل کے لیے مبین مرزا نے عالمی ادب سے مثالیں ہمارے سامنے رکھیں جن سے ادیب کی سماجی وابستگی عیاں ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

یورپ کے مختلف معاشروں اور مختلف ادوار میں ہمیں اپنے عہد اور اس کی انسانی اور
مخصوص سماجی صورتِ حال سے ادیبوں کی وابستگی اور وفاداری کا اظہار کھلے بندوں نظر
آتا ہے۔[۴۸]

مکالمہ کے شمارہ ۲۱ میں جو اداریہ سپرد قلم کیا اس کا عنوان 'اکیسویں صدی میں ادب اور قاری کا رشتہ" ہے۔ زیرِ بحث اداریے میں انہوں نے اسی سوال کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ادب اور قاری اور ادیب اور سماج کے رشتے پر بحث کی۔ اور اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ جدید دور میں ادب کے حوالے سے فرد میں جو تبدیلی آئی وہ ادب سے اس کی دوری ہے اور ادب سے دوری ایک اہم سماجی تبدیلی ہے۔ جو کہ صرف ہمارے ہاں ہی محسوس نہیں کی جارہی بلکہ عالمی سطح پر اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مدیرِ مکالمہ کے مطابق وہاں کے اداریے اس سماجی تبدیلی کا باقاعدہ ریکارڈ رکھے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

یورپ اور امریکا میں سماجی رویوں کی تبدیلی اور تخمین و ظن کا کام کرنے والے باقاعدہ
ادارے ہیں جو اپنے معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کو نہ صرف نوٹ کرتے ہیں بلکہ
ان کے عقب میں کارفرما محرکات کا بھی سراغ لگاتے ہیں۔[۴۹]

چنانچہ ان جدید سیاسی و سماجی رجحانات کے بدلنے سے جو تبدیلی آئی اس کا اثر معاشرے کی تہذیبی تخریب میں نظر آتا ہے جس کی تعمیر میں اہم کردار ایک ادیب سرانجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا مدیرِ مکالمہ ادیب سے ایسے ادب کی تخلیق کا مطالبہ کرتے ہیں جو تہذیبی تخریب کے اس دور میں تہذیبی تعمیر کا کام کر سکے۔ اگر ہم عالمی سطح پر دنیا کے معاشروں کی صورتِ حال کا جائزہ لیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ بدامنی اور انتشار آج کے اس دور کے وہ مسائل ہیں جو دنیا کے ہر ملک و معاشرے کو درپیش ہیں۔

ماضی میں اگر کسی خطہ ارض پر کوئی واقعہ یا حادثہ پیش آتا تھا تو وہ صرف اسی خطے کو متاثر کرتا تھا مگر جوں جوں معاشرہ ترقی کے نام پر بدلتا گیا وہیں زمینی فاصلے بھی سمٹتے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا ایک عالمی گاؤں (Global

(Village کی شکل اختیار کر گئی۔ ایسے میں کسی ایک ملک میں ہونے والی تبدیلی کا اثر فوری طور پر دوسرے ملک پر پڑنا ایک لازمی امر ہے۔ اسی طرح بدامنی جیسا سنگین مسئلہ اگر کسی ایک ملک کو درپیش ہے تو دیگر ممالک بالواسطہ یا بالواسطہ اس سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مبین مرزا لکھتے ہیں:

> اب جہاں تک بدامنی کا معاملہ ہے۔ تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ آج صرف ہمارا نہیں، عالمی سطح کا مسئلہ ہے۔ بلکہ سیاست اور صحافت سے وابستہ افراد نے تو واضح لفظوں میں کہا ہے کہ یہ آج کی انسانی دنیا کا کسی بھی تخصیص کے بغیر سب سے بڑا مسئلہ ہے۔[۵۰]

گزشتہ سطور میں جہاں ادیب کی سماجی ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا وہیں یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ اس سماجی مسئلے کے حوالے سے ادیب کی کیا ذمہ داری ہے؟ اس موضوع کو شمارہ ۲۰ کے اداریے بعنوان "ادیب اور قیامِ امن" میں زیرِ بحث لایا گیا۔ وہ اس سوال کو یوں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ:

> آج انتشار اور بدامنی کے دور میں ہمارے معاشرے کو سب سے زیادہ ضرورت قیامِ امن کی ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے میں ادیب کا کردار کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے؟[۵۱]

ادیب اور سماج کے تعلق کو بھی گزشتہ سطور میں واضح کیا جا چکا ہے۔ ادیب سماج سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ اس میں تبدیلی کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔ وہ جہاں معاشرے کی اخلاقیات اور امن سے متصادم صورت حال دیکھتا ہے اس کے خلاف مزاحمت بھی پیش کرتا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے ادب کا سہارا لیتا ہے۔ وہ اس خارجی صورتِ حال سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے انداز سے قاری میں احساس و شعور کی روح پھونکتا ہے۔ یہی احساس و شعور جب اس کی تخلیق کے ذریعے معاشرے کے لوگوں میں منتقل ہوتا ہے تو تبدیلی کی لہر اٹھتی ہے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو اس انتشار اور بدامنی کے ماحول میں وہ اپنا کردار خود ہی متعین کرتا اور بخوبی سر انجام دیتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اسے کسی حکم کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ مبین مرزا لکھتے ہیں:

> ادیب و شاعر اپنے اطراف کی انسانی، تہذیبی اور سماجی ضرورتوں کا اثر نا صرف قبول کرتا ہے بلکہ ان کے زیرِ اثر خود یہ طے کرتا ہے کہ اپنی تہذیب اور سماج کے لیے اس وقت اس کا کردار کیا ہے۔[۵۲]

ادیب اپنے دور کے مسائل و معاملات سے بے خبر ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ لاشعوری طور پر ان کے حوالے سے ردعمل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی عہد کی سیاسی و سماجی صورتِ حال اس دور کے لکھے ہوئے ادب میں تلاش کر سکتے ہیں لیکن یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ قیامِ امن جیسے اہم اور عالمگیر مسئلے کے حل کی ذمہ داری صرف ادیب پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مدیرِ مکالمہ اس بات کا اعادہ بھی کرتے ہیں کہ ادیب ان تمام عوامل کا ایک حصہ ضرور ہے جو اس مسئلے کے حل کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ادیب اپنے انداز سے معاشرے کے لوگوں کی

سوچ کو نیا رخ دے سکتا ہے جیسا کہ دنیا کے بڑے ممالک کے ادب اور ادیبوں نے انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ ویسے ہی کردار کا مطالبہ آج کے دور کی اہم ضرورت ہے۔ اور اس مقصد کے لیے ادیب کا سماج کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ زیرِ بحث اداریے میں مدیرِ مکالمہ جدید دنیا کے اس بدامن معاشرے میں قیام امن کے لیے ادب کے کردار کو واضح کرتے ہیں۔ ادب کی اسی سماجی طاقت کا اظہار ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی یوں کرتے ہیں:

> ادب کے جہاں اور دوسرے منصب ہیں۔ وہاں ایک منصب یہ بھی ہے کہ وہ انسانی اقدار کی قدر و منزلت کا نا صرف اظہار کرے بلکہ وہ اس احساس کو قاری کے رگ و پے میں پیوست کر دے اور اس کا ذہن یہ سوچنا شروع کر دے کہ انسانیت کی تعمیر اور اخلاق جو کہ زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں اور ہماری شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتے ہیں، انسان کے ذہن پر اثر انداز ہوتے اور اس گہرائی اور گیرائی کی واقفیت کے لیے ایک ماحول کی ضرورت ہے۔ اس ماحول کو ساز گار اور موثر بنانے میں ادب ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ [۵۳]

اسی مسئلے کو دسمبر ۲۰۱۶ء کے شمارے میں ایک بار پھر موضوع بحث بنایا گیا۔ اور زیرِ بحث اداریے کو "ادب اور خراب حالات" کا عنوان دیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج عالمی سطح پر دنیا کے تمام معاشروں میں یہ بات سننے کو مل رہی ہے کہ حالات کی خرابی ہی دراصل ادب کے زوال کی وجہ ہے اور یہ کہ بدامنی انتشار اور برے حالات میں ادب ترقی نہیں پا سکتا۔ تو مدیرِ مکالمہ نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ماضی کے اوراق سے وہ تمام مثالیں اٹھا کر قاری کے سامنے رکھیں کہ جب بدامنی، انتشار، تخریب اور خراب حالات نے ادب کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ چنانچہ انہوں نے قاری کو اس گفتگو کا حصہ بناتے ہوئے اس کے آگے یہ سوال رکھا کہ: "ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ حالات کی خرابی نے ادب پر اب تک کیا اور کیسے اثرات مرتب کیے ہیں۔ [۵۴]

اس سوال کے جواب میں انہوں نے اردو ادب کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر ممالک کے ادب سے بھی مثالیں پیش کی کہ ہر دور میں اور ہر عہد میں حالات کے دباؤ، مایوسی، بدامنی کے ماحول میں ادیب نے زیادہ کام کیا ہے۔ وہ اسے انسانی نفسیات قرار دیتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں کوئی انسان خرابی حالات میں اپنی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر انداز سے استعمال کر سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "حالات کا دباؤ انسانوں اور تہذیبوں کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور یہ صلاحیتیں جہد بقا کا راستہ دکھاتی ہیں۔" [۵۵]

لہٰذا اس تمام صورتِ حال کے تناظر میں وہ آج کے دور میں بھی ادیب سے اس کے اس کردار کا مطالبہ کرتے ہیں جو وہ ماضی میں ادا کرتا آ رہا ہے۔

۳۔مکالمہ کے اداریوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ بین الاقوامی مسائل کی پیش کش کا جائزہ:

اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ ہی عالمی سطح پر پوری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا ایسا انقلاب برپا ہوا جس نے دنیا کے تمام ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیا اور دنیا کا کوئی خطہ اس جدید سائنسی انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ انقلاب جو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی شکل میں رونما ہوا۔ اس لیے معلومات کا وسیع خزانہ فردِ واحد کے ہاتھ میں منتقل ہوا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے اس جدید معلوماتی ترقی نے دنیا کے تمام ممالک کے معاشروں کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اس سائنسی ترقی نے فردِ واحد کے رہن سہن، تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ فکر و نظر اور سوچ کے زاویوں کو بھی یکسر تبدیل کر ڈالا۔ غرض سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس لامحدود سیلاب نے محض چند سالوں میں دنیا کے تمام شعبہ ہائے جات، معیشت، معاشرت، سیاست، اخلاقیات غرض تمام علوم و فنون مشمول ادب کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی یہ ترقی انسان کے فائدے اور سہولت کے لیے تھی مگر ہر شے کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ منفی پہلو بھی ہوتے ہیں اور یہی حال اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب کے ساتھ بھی ہوا۔ انسان نے اسی ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے راحت و آرام کے کئی وسیلے ڈھونڈے۔ کام کی مشکلات کو آسان کیا، سورج، چاند، ستاروں پہ کمندیں ڈالیں۔ لیکن اس ترقی کا دوسرا رخ بھی ہے جو سماج کے لیے زیادہ خطرناک ہے اور معاشرے پر مضر اثرات ڈال رہا ہے۔ لہٰذا عصرِ حاضر میں ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے مثبت اثرات کے بیان کے ساتھ ساتھ اس سے ہونے والے منفی اثرات سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مشین کی دنیا، سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا سے پہلے معاشرے کی جو صورتِ حال تھی وہ زمانہ حال یعنی مشینی و سائنسی دور سے یکسر مختلف تھی۔ اس سائنسی ترقی نے سماج کو مختلف انداز سے متاثر کیا۔ بظاہر مادی تبدیلی نے تہذیبی سطح پر بھی اثرات ڈالے اور یوں فنونِ لطیفہ کے شعبہ جات بشمول ادب کو بھی متاثر کیا۔ جیسا کہ نند کشور وکرم لکھتے ہیں:

> ٹی وی کی مقبولیت اور اس کے نئے نئے کثیر چینلوں پر انواع و اقسام کے پروگراموں، سیریلز اور ڈراموں نے افسانے کو اتنا متاثر کیا ہے کہ عوام افسانے پڑھنے پر ان کو ترجیح دینے لگے ہیں جس سے کتب و رسائل حتیٰ کہ اخباروں کی بھی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ کیونکہ اخبار کی اشاعت سے پہلے ہی لوگوں کو مختلف نیوز چینلوں سے خبریں جلدی مل جاتی ہیں کہ اخبار ایک طرح سے باسی ہو کر رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں اخبار کی وقعت و اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔[۵۶]

مکالمہ کا اجراء بیسویں صدی کے اختتام پر ہوا اور یہی وہ دور تھا کہ جب دنیا میں سائنس کی ترقی کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمکا۔ اور اس کی چمک نے پوری دنیا کو ہر دو انداز (مثبت و منفی) سے متاثر کیا۔

اس ترقی نے ادب میں بھی کئی قسم کے مسائل کو جنم دیا۔ اور دنیا کو سہولیات و آسائشات تو فراہم کیں۔ مگر فکر و احساس کی نعمت جو سائنسی انقلاب سے پہلے ہماری نسلوں اور قوموں میں موجود تھی اسے ختم کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا ایک نئے رنگ میں نظر آتی ہے۔ اس تبدیل شدہ دنیا کا نقشہ جمیل جالبی ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> آج کی اس جدید زندگی میں سائنس پر غیر معمولی زور ہے سائنسی نے اشیاء کو تو ہمارے شعور میں داخل کر دیا ہے مگر فکر و احساس کو زندگی سے نکال باہر کیا ہے اور اسی وجہ سے اس وقت ساری دنیا ایک ہولناک عدم توازن کا شکار ہے۔ زندگی ساری اور حیرت انگیز ایجادات و انکشافات کے باوجود معنویت سے عاری ہو گئی ہے۔[۵۷]

ماجرا یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک بھی ٹیکنالوجی کی دوڑ کے اس سفر میں شمولیت اختیار کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات سے متاثر نا ہونا اس کے بس میں نہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی یہ ایجادات بھی وقت کے تغیر کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا دنیا کا ہر ملک ان سے متاثر ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ مکالمہ کے اداریوں میں بھی مدیرِ مکالمہ نے سائنسی ترقی سے پیدا شدہ ان مسائل و موضوعات کی نشاندہی کی ہے۔ جنہوں نے کسی خاص ملک نہیں بلکہ عالمی سطح پر دنیا کو متاثر کیا ہے۔

طاقت ور کا کمزور پر حکومت کرنے کا خواب اور اقتدار کی خواہش ہمیشہ سے چلتی آ رہی ہے ہر دور میں فتح کا خواب طاقت کے بل بوتے پر، ہتھیاروں کے ذریعے اور اسلحے کے زور پر ہی تعبیر پاتا رہا ہے۔ لیکن عصرِ حاضر میں دنیا کی مقتدر قوتوں نے ایک نیا ہتھیار ایجاد کیا جس سے بنا خون خرابہ قوموں اور نسلوں کے ذہن و دل اور ان ممالک کے وسائل پر قبضہ ممکن ہو سکا ہے اور یہ جبلی ہتھیار کیبل، انٹرنیٹ کے نام سے موسوم ہوا۔ اس جدید ذرائع مواصلات کو مقتدر قوتوں کی جانب سے بطور ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے انسانی ذہنوں کو مسخر کیا جا رہا ہے۔ مدیرِ مکالمہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید اثرات کے اس رخ کی نشان دہی کی اور اکیسویں صدی کی آمد سے پہلے ہی اس خطرے کو محسوس کر کے قاری کو اس پر سوچنے پر دعوت دی۔ مکالمہ کے شمارہ ۳ کے اداریے بعنوان "ادب اور جدید عہد کی صورتِ حال" میں اس مسئلے کی نشان دہی یوں کی ہے:

> ڈش کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی پوری توجہ انسان کے جبلی اور ہیجانی رویوں کو Entertain کرنے پر مرکوز ہے۔ ایسے میں اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا گیا کہ جبلی رویوں کی مادر پدر آزادی بھی اتنی ہی ہلاکت خیز اور ضرر رساں ہے جتنی کیمیائی ہتھیاروں کی۔[۵۸]

کسی رسالے یا جریدے میں لکھے گئے اداریوں میں نا صرف حال کے مسائل پر آواز اٹھائی جاتی ہے بلکہ مدیر کی بصیرت اکثر اوقات مستقبل کے پیش آئندہ خطرات سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ چنانچہ شمارہ ۷ کے لیے لکھے گئے اداریے میں اس مسئلہ کو ایک بار پھر اٹھایا گیا اور یہ پیشن گوئی کی گئی کہ زمانہ حال میں دنیا میں فتح کا تصور بدل چکا ہے۔ اس جدید عہد میں دنیا کی مقتدر قوتیں جغرافیائی سرحدوں کی بجائے ذہنی سرحدوں پر قبضہ کرنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ اور یہ جدید انسان کے نزدیک فتح کا تصور ہے۔ انہوں نے اس اداریے میں اس ذریعے کے بارے میں بھی بتایا جسے اس مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے ان کے مطابق اس ذہنی تسخیر کے لیے جو ہتھیار استعمال کیا جارہا ہے وہ انٹرنیٹ اور کیبل سسٹم ہے۔ وہ اس مسئلے کی نشان دہی یوں کرتے ہیں:

> مقتدر قوت اپنے سارے مفتوحین کو ایک ہی ذہنی سانچے میں ڈھالے گی اور یہ کام مرکز میں بیٹھے ہوئے چند افراد کریں گے۔ نیٹ ورک اور کیبل سسٹم کی برکت اس کام کو آسان بنانے میں معاون ثابت ہو گی۔[۵۹]

اسی مسئلے کو مکالمہ کے شمارہ ۲۱ میں بھی موضوع بحث بنایا گیا۔ مکالمہ ۲۱ کے شمارے میں تحریر کردہ اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے اکیسویں صدی میں الیکٹرانک میڈیا کے انقلاب کے ان اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ جو اسے عالمی طاقتوں کے ہاتھوں بطور ہتھیار استعمال کرنے سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماضی میں ترقی یافتہ ممالک کمزور اقوام کو طاقت کے بل بوتے پر اپنے زیرِ تسلط لاتی تھیں اور آج جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے نو آبادیات قائم کی جارہی ہیں۔ چنانچہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں ان سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کے طوفان میں ادب کے مقام کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ادب ہی وہ وسیلہ ہے جو ان عصری مسائل سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ جہاں دنیا کی مقتدر قوتیں الیکٹرونک میڈیا کو کمزور ممالک میں تہذیبوں کے خاتمے اور فکری و ذہنی استحصال کے لیے بطور ہتھیار استعمال کر رہی ہیں۔ وہیں ادیبوں کو چاہیے کہ ادب کے ذریعے لوگوں میں فکر و نظر کی روشنی فراہم کرے اور تہذیب و اقدار کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ لہٰذا مکالمہ کے لیے لکھنے والے لکھاریوں سے وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو اس عصری عالمی صورت حال سے نبرد آزما ہو سکے اور انسانی قلب و ذہن کو درست سمت دکھا سکے اور یہی مکالمہ کی پالیسی ہے۔

مکالمہ ۸ کے اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے ایک اہم مسئلے کی نشان دہی کی وہ کہتے ہیں کہ آج کا جدید انسان جو اپنی ذات کے خول میں سمٹتا جارہا ہے اور اجتماعی طور پر غور و فکر کی عادت ترک کر چکا ہے۔ ہر طرف وقت گزاری کا طریقہ کار فرما ہے۔ ہر فرد اپنے اردگرد سے بیگانہ نظر آتا ہے۔ اور یہ صورتِ حال صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ یہ عالمی مسئلہ ہے۔ مدیرِ مکالمہ اس صورتِ حال کو عالمی طاقتوں کی کارستانی قرار دیتے ہیں اور جدید ٹیکنالوجی کی

ایجادات (ٹی وی، ڈش اور انٹرنیٹ) کو ان کے ہتھیار قرار دیتے ہیں۔ ان جدید ذرائع مواصلات کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یہ تفریح کے نہیں بلکہ فرسٹریشن پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ ان کے مطابق یہ عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کی کارستانی ہے کہ وہ میڈیا کو تفریح کے نام پر بے چینی، اضطراب اور فرسٹریشن پیدا کرنے کا ذریعہ بنا رہی ہے۔ کمزور ممالک میں ٹیکنالوجی کے ذریعے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے دماغوں کو اپنی ڈگر اور اپنے طریقہ کار کے مطابق سوچنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، فضولیات میں الجھا کر لوگوں کو فکر و عمل اور سوچنے سے باز رکھا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "بس مختصر لفظوں میں یہ جان لیجیے کہ یہ سپر پاورز کی گیم ہے اور اس لیے ہے کہ آپ کی سوچ کے دائرے کو محدود تر رکھا جائے۔"[۶۰]

زیرِ بحث اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے جس مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ حقیقی معنوں میں توجہ طلب ہے اور اس پر غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ادب کا تعلق فنون لطیفہ کے اس شعبے سے ہے کہ جو غور و فکر کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور فکر و احساس سے پروان چڑھتا ہے۔ ادیب غور و فکر کر کے سوچ کے در وا کر کے ارد گرد کے حالات و واقعات سے احساس لے کر فن پارہ تخلیق کرتا ہے اور قاری کو بھی اس سوچ میں ہم راز بناتا ہے۔ لیکن عصرِ حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کی زندگی کو جس طرح ایک مشین بنا ڈالا ہے اس سے انسان کے پاس غور و فکر کا وقت بھی دستیاب نہیں۔ اور یوں وہ اپنے ارد گرد اور معاشرے سے لاتعلق اور بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> انسان کے علم و عمل کا دائرہ سائنس اور مشین تک سمٹ آیا ہے اور وہ اپنے سارے مسائل انہی کے ذریعے طے کرنا چاہتا ہے۔ اسی تحریک پر اس کی ساری ذہانت اور توجہ صرف ہو رہی ہے۔ اسی جدوجہد میں اس نے تفریحات اور اطلاعات کے بہت سے نئے کھول دیے ہیں جن میں سے بعض ادب کے براہِ راست حریف ہیں کیوں کہ وہ بلا زحمت عام آدمی کا دل بہلا لیتے ہیں۔[۶۱]

سائنس اور ٹیکنالوجی نے بین الاقوامی سطح پر فرد کے رویوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ عہدِ جدید میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے مدیرِ مکالمہ نے جدید انسان کے نفسیاتی تغیرات کا سبب بھی اسی ٹیکنالوجی کو قرار دیا ہے۔ ترقی کی اس تیز رفتاری نے فرد کے احساسات کو بھی تبدیل کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ مکالمہ کے شمارہ ۱۸ میں اس مسئلے کی نشان دہی یوں کی گئی ہے:

> آج کی دنیا نصف صدی قبل کی دنیا سے یوں بھی مختلف ہے کہ اس میں زندگی کے اسلوب اور انسانی تجربہ و احساس کے سانچے میں بھی نمایاں قسم کی تبدیلی آئی ہے اس تبدیلی کا سرنامہ ٹیکنالوجی میں برپا ہونے والا انقلاب ہے۔[۶۲]

سائنس اور ٹیکنالوجی نے رسل و رسائل اور ابلاغ کے ذرائع میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یہاں تک کہ آج کی دنیا ماضی کی دنیا سے مکمل تبدیل شدہ دنیا ہے۔ اور یہ تبدیلی انسانی نفسیات میں تبدیلی کا باعث بھی بنی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے جدید انسان کو جغرافیائی لحاظ سے تو ایک دوسرے سے قریب مگر ذہنی اعتبار سے بہت دور کر دیا ہے۔ سائنسی ایجادات ہر فرد کی دسترس میں ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں بلا تفریق لوگ ان کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس ساری صورتِ حال کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہر فرد دوسروں سے بظاہر تو قریب مگر حقیقتاً انتہائی دوری پر ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے ایک انسان سات سمندر دور کسی دوسرے براعظم میں موجود کسی اجنبی کے ساتھ تو مسلسل رابطے میں ہے۔ مگر گھر میں موجود افراد کے ساتھ گفتگو کیے ہوئے شاید کئی دن گزر جائیں اور احساس تک نہ ہو۔ دنیا کے حالات سے باخبر انسان ساتھ کے کمرے میں موجود فرد سے بے پرواہ ہے اور یہی اس جدید دور کی حقیقت ہے۔ اس مسئلے کی نشاندہی مکالمہ کے شمارہ ۲۱ میں یوں ہوتی ہے:

> ایک اور بہت اہم مسئلہ یہ ہے کہ الیکٹرونک اور سوشل میڈیا نے بظاہر میں دنیا کی طنابیں کس دی ہیں جغرافیائی اور زمینی فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افراد اپنی اپنی ذاتی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ کھو گئے ہیں کہ وجودی سطح پر قریب رہنے والے دو افراد کے درمیان بھی براعظموں کا فاصلہ در آیا ہے۔[۳۳]

فرد اور معاشرے کے یہ بدلتے رجحانات اور رویوں کے باعث آج کی دنیا ماضی کے مقابلے میں ایک مختلف دنیا نظر آتی ہے۔ سماجی رویے تغیر پذیر ہوتے ہیں اور سماجی رجحانات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے تبدیلی ترقی کے لیے لازمی امر ہے۔ مگر زمانہ حال میں ان سماجی رویوں میں جو انقلاب برپا ہوا۔ یہ ماضی میں ہونے والی تبدیلیوں کے مقابلے میں کئی گنا تیز اور شدید ہے اور مدیرِ مکالمہ' کے مطابق تبدیلی کے اس عمل کا ایک اہم عنصر عہدِ حاضر کے برقی ذرائع ہیں۔ ٹیکنالوجی کے ان مضر اثرات نے جہاں فردِ واحد کے سماجی رویوں کو متاثر کیا وہیں ادب اور ادیب کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا اور یوں عہدِ حاضر کے ادیب کے سامنے ایک نئی اور جدید دنیا ہے جو مکمل طور پر ٹیکنالوجی کے اثرات کے زد میں ہے۔

مدیرِ مکالمہ کے مطابق جس طرح آج کا فرد ذہنی تخریب و نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے وہیں ادیب جو کہ معاشرہ کا زیادہ حساس شخص ہے وہ بھی اسی تناؤ کا شکار ہے۔ اور یوں سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ سیلاب ادب کی دنیا میں بھی ہلچل پیدا کرنے کا باعث ہے اور ادبی زوال کی ایک وجہ بھی ہے۔ عالمی سطح پر سائنس اور ٹیکنالوجی نے جس طرح انسانی زندگی کو متاثر کیا اور جن مسائل کو جنم دیا ان کا بیان وقتاً فوقتاً مکالمہ کے اداریوں میں ملتا ہے۔ کیونکہ ادب کو آج کے دور میں اس جدید ٹیکنالوجی کے اثرات سے نبرد آزما ہونا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو گا جب ان مضر

اثرات سے آگہی ہو سکے گی۔ ایسے میں مدیرِ مکالمہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ان مضر اثرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ان چند افراد سے جو حقیقی معنوں میں ادب کی خدمت میں مصروف عمل ہیں، یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جو انسان کو فکر و شعور کی دولت سے مستفید کرے اور انہیں فکر و احساس کی نعمت سے نوازے۔ جمیل جالبی بھی ادب سے یہی مطالبہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی تصنیف ادب کلچر اور مسائل میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

> ساری دنیا اس وقت ایک ایسے نظام خیال اور تصور حقیقت کی تلاش میں ہے جس سے انسان اپنے وجود کو با معنی بنا سکے۔ یہ تمام ادب کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔[۱۴]

اس الیکٹرونک انقلاب نے نا صرف ہمارے ہاں ملکی سطح پر مسائل کو جنم دیا بلکہ عالمی سطح پر بھی کئی قسم کے مسائل پیدا کیے ہیں۔ عصرِ حاضر میں الیکٹرونک میڈیا بڑی حد تک طاقت ور اور خطرناک ہو چکا ہے اس کے انسانی زندگی کو پہنچنے والے فائدے نقصانات کی نسبت کم دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں یہ ذرائع آسانی پیدا کرنے میں مددگار ہیں وہیں ان کے نقصانات بھی ہیں۔ جہاں یہ ہمیں تفریح فراہم کرتے ہیں وہیں یہ معاشرے میں فحاشی و عریانی پھیلانے کا سبب بھی بن رہے ہیں۔ اور عالمی سطح پر اخلاقی قدروں کے زوال کی ایک بڑی وجہ ہیں۔

مکالمہ کے شمارہ ۱۱ میں لکھے گئے اداریے بعنوان "ادب فحاشی اور معاشرہ" میں اس عصرِ حاضر کے مسئلے کو اجاگر کیا گیا اور ایسے مسئلے کی نشان دہی کی گئی جو دنیا بھر کے معاشروں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ بقول مبین مرزا:

> گزشتہ تین دہائیاں تو خیر ایک ایسی رستہ خیز سے عبارت ہیں کہ جس نے ہماری کایا پلٹ کر کے رکھ دی جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ یہ کچھ ہماری ہی افتاد نہیں بلکہ دنیا بھر کے سارے روایتی، تہذیبی ڈھانچوں کو اس عرصے میں کچھ اسی قسم کا ماجرا پیش آیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں آنے والی اپنی قبیل کے اس انوکھے انقلاب میں الیکٹرونک میڈیا نے نہایت غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔[۱۵]

دنیا کی بقا کی بنیاد اس تہذیب و اقدار کے نظام پر ہوتی ہے۔ جو صدیوں کے سفر سے بنتی ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ تہذیب قوم کی شناخت ہوتی ہے لیکن آج دنیا کے تمام ممالک کی تہذیبیں اس جدید ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ اور ڈش و کیبل کی زد میں ہیں۔ ان نئی ایجادات نے کس کس طرح عالمی سطح پر فرد، معاشرہ اور معاشرے کے شعبہ جات کو متاثر کیا ان کی نشان دہی مکالمہ کے اداریوں میں ملتی ہے۔ عالمی سطح پر تہذیب و اقدار کا زوال جدید عہد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ چونکہ ادب بھی تہذیب کا ایک اہم شعبہ ہے۔ لہٰذا وہ بھی روبہ زوال دکھائی دیتا ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کی اس ترقی نے آزاد خیالی اور تفریح کے نام پر فحاشی کو فروغ دیا اور تفریح کے نام پر عریانی اور ابتذال کو ہمارے معاشروں اور زندگیوں میں اس طرح داخل کیا کہ اس نے ہماری تہذیبی اقدار کا معیار بدل کر رکھ

دیا ہے اور اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان اپنی تہذیب و اقدار سے دور ہوتا گیا اور آج دنیا بے اقداری اور بے تہذیبی کا نمونہ پیش کر رہی ہے۔ مگر جدید انسان کو اس کا ادراک تک نہیں۔

ٹیکنالوجی نے ان اثرات نے عالمی سطح پر تہذیب و اقدار کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا حل وہ ادب کے فروغ کو قرار دیتے ہیں کیونکہ ادب ہمیشہ سے تہذیبی قوت کا کام کرتا رہا ہے۔ مدیرِ مکالمہ بھی عہدِ حاضر میں ادب اور ادیب سے یہی مطالبہ کرتے ہیں اور مکالمہ کی اشاعت اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> اس عفریت کا مقابلہ کرنے کی ابھی ایک صورت باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنی تہذیب اور اس کی اقدار پر اپنا یقین بحال کریں اور نئی نسل کو ان اقدار کے شعور سے بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں۔[۲۶]

تہذیب و اقدار کے زوال میں جدید ٹیکنالوجی اور اس کی ایجادات جس طرح کردار ادا کر رہی ہیں اس کو مکالمہ کے اداریوں میں بارہا موضوع بحث بنایا گیا۔ ان تمام گوشوں کو بے نقاب کیا گیا جو تہذیب و اقدار اور در حقیقت ادب کے زوال کی وجہ ہیں۔ مکالمہ کے شمارہ ۲۶ میں مدیرِ مکالمہ نے ایک اہم عالمی مسئلہ قارئین کے سامنے رکھا تاکہ ان جدید مسائل پر گفتگو اور بحث کی جا سکے۔ ''جدید دنیا، روبوٹ اور ادب'' کے عنوان سے لکھے گئے اس اداریے میں مدیرِ مکالمہ نے ٹیکنالوجی کی دنیا کی تیز رفتار ترقی کی جس مضر ایجاد کا تذکرہ کیا وہ عصرِ حاضر میں انسانی تہذیب، اخلاق اور ثقافت پر ایک کاری ضرب ہے۔

سائنس کی ترقی اور جدید ایجادات کوئی بری شے نہیں مگر تب تک ہی جب تک وہ انفرادی سطح پر انسانی جبلت، نفسیات اور ذات، اور اجتماعی سطح پر معاشرتی و اخلاقی اقدار سے متصادم نا ہو۔ اور ایسی ہی ایک مضر ایجاد جنسی روبوٹ کی ایجاد ہے۔ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مدیرِ مکالمہ نے ان تمام افراد کا بھی حوالہ دیا جو اس کے حق میں یا اس کے خلاف ہیں۔ مدیرِ مکالمہ کے مطابق یہ ایجاد دنیا کو بے اقدار و بے تہذیب کرنے کی سازش کا حصہ ہے اور انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ یہ سب ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس ایجاد پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اور ان کی ادبی بصیرت یہ دیکھ رہی ہے کہ مستقبل قریب میں اس مضر ایجاد کے اثرات دنیا کے تمام معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے کیونکہ یہ دنیا عالمگیریت کی دنیا ہے۔ جو ایک عالمی گاؤں سے زیادہ بڑی نہیں۔ چنانچہ اس مسئلے کے بیان کے ساتھ وہ قاری کی راہنمائی اس کے حل کی جانب بھی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق کسی بھی ملک کا زبان و ادب ہی وہ وسیلہ ہے جو اس جدید عہد کے طوفانوں کے سامنے بند باندھ سکتا ہے۔ اگرچہ یہ کام قدرے مشکل ہے کیونکہ دریا کا ریلا جس تیزی سے آ رہا ہے اس کے آگے یہ بند صرف ایک کوشش ہی ثابت ہو سکتا ہے مگر مدیرِ مکالمہ پر امید دکھائی دیتے ہیں اور آج کے دور کے ادیب کو تہذیب کی حفاظت کی ذمہ داری

سونپتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق ادب ہی تہذیب کی بقا کا ضامن ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، س ن) صفحہ ۳۴

۲۔ پروفیسر سحر انصاری "اکیس وی صدی اور ادیب" مشمولہ مکالمہ ش ۲۰ (جنوری ۲۰۱۲ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء) ص ۴۲۹۔

۳۔ نند کشور وکرم "پیش لفظ مشمولہ مجلہ عالمی اردو ادب ج ۲ (نومبر ۲۰۰۹ء): ص ۹۔

۴۔ مبین مرزا، "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳ (مارچ ۲۰۱۷ء): ص ۵۔

۵۔ شمس الرحمن فاروقی، "قوم، ریاست اور معاصر اردو ادب" مترجم احمد محفوظ مشمولہ مکالمہ ش ۳ (جولائی ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء): ص ۵۵۰۔

۶۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳ (جون ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء): ص ۱۲۔

۷۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۴۴۔

۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳ (جولائی ۱۹۹۸ء تا ۱۹۹۹ء): ص ۱۳۔

۹۔ ڈاکٹر سید عبد الباری "مغرب کی تہذیبی یلغار اور ہندوستان کا تمدنی انتشار" مشمولہ روشنی بکھرتی ہے مرتبہ انتظار نعیم (دہلی: ادارہ ادب اسلامی ہند ۲۰۱۲ء)، ص ۱۲۱۔

۱۰۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۰ (جنوری تا جون ۲۰۰۳ء): ص ۱۰۔

۱۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۶ (جنوری تا جون ۲۰۰۵ء): ص ۱۰۔

۱۲۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص ۱۷۴۔

۱۳۔ عبد المغنی، "ادب کیا ہے؟" مشمولہ روشنی بکھرتی ہے مرتبہ انتظار نعیم (دہلی: ادارہ ادب اسلامی ہند، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۰۔

۱۴۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۶ (جنوری تا جون ۲۰۰۵ء): ص ۱۱۔

۱۵۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش 21 (جنوری ۲۰۱۴ء تا جولائی ۲۰۱۵ء): ص ۱۲۔

۱۶۔ ریاض صدیقی، اردو زبان و ادب کے مسائل (کراچی: نفیس اکیڈمی اردو بازار، جولائی ۱۹۸۴)، ص ۲۴۲۔

۱۷۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص ۱۸۵، ۱۷۶۔

۱۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۱ (جنوری ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء): ص ۱۵۔

۱۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۳ (جون تا اگست ۲۰۱۶ء): ص ۸،۷۔

۲۰۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳۲ (مئی ۲۰۱۷ء): ص ۶۔

۲۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۸ (جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء): ص ۱۳۔

۲۲۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳۲ (مئی ۲۰۱۷ء): ص ۷۔

۲۳۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۸ (جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء): ص ۱۶۔

۲۴۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳۲ (مئی ۲۰۱۷ء): ص ۸۔

۲۵۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۴۱ (اکتوبر ۲۰۱۸ء): ص ۸۔

۲۶۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء): ص ۱۴۔

۲۷۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۳ (جون تا اگست ۲۰۱۶ء): ص ۷۔

۲۸۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، ادب علمی و فکری زاویے (کراچی: نفیس اکیڈمی اردو بازار، جنوری ۱۹۹۴ء)، ص ۴۹۔

۲۹۔ اے بی اشرف، "اردو ادب کا مستقبل" مشمولہ ادبی جائزے مرتبہ خالد اقبال یاسر (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۶ء) ص ۶۱۔

۳۰۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۰ (جنوری تا جون ۲۰۰۳ء): ص ۹۔

۳۱۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۲ (جنوری تا جون ۲۰۰۴ء): ص ۱۱۔

۳۲۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۲ (جنوری تا جون ۲۰۰۴ء): ص ۱۰۔

۳۳۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۰ (جنوری ۲۰۱۰ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء): ص ۱۲۔

۳۴۔ شمس الرحمن فاروقی، "قوم، ریاست اور معاصر اردو ادب" مترجم: احمد محفوظ مشمولہ مکالمہ ش ۳ (جون ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء): ص ۵۴۷۔

۳۵۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۴ (اپریل تا اکتوبر ۱۹۹۹ء): ص ۱۴۔

۳۶۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۵ (نومبر ۱۹۹۹ء تا مئی ۲۰۰۰ء): ص ۱۰۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۸،۱۰۔

۳۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۴ (اپریل تا اکتوبر ۱۹۹۹ء): ص ۱۴۱۔

۳۹۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب و انقلاب، ص ۱۴۴۔

۴۰۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۷ (اکتوبر ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء): ص ۱۰۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۴۲۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۰ (جنوری یا جون ۲۰۰۳ء): ص ۹۔

۴۳۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر (کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء): ص ۲۹۔

۴۴۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۰ (جنوری تا جون ۲۰۰۳ء): ص ۱۰، ۹۔

۴۵۔ احسن سلیم، "آج کا ادیب اور جدید ادبی رجحانات" مشمولہ روزنامہ جنگ (کراچی: ۲ مئی ۲۰۱۸ء)

۴۶۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۶ (نومبر ۲۰۱۶ء): ص ۵۔

۴۷۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء): ص ۱۳، ۱۴۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۴۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۱ (جنوری ۲۰۱۴ تا جون ۲۰۱۵ء): ص ۱۲۔

۵۰۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۲۰ (جنوری ۲۰۱۲ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء): ص ۱۳۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۵۲۔ ایضاً۔

۵۳۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، ادب۔ علمی و فکری زاویے (کراچی: نفیس اکیڈمی اردو بازار، جنوری ۱۹۹۴ء): ص ۴۳۔

۵۴۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش، ۲۷ (دسمبر ۲۰۱۶ء)، ص ۵۔

۵۵۔ ایضاً۔

۵۶۔ نند کشور وکرم، مشمولہ عالمی اردو ادب (نومبر ۲۰۰۹ء): ص ۹۔

۵۷۔ جمیل جالبی، ادب، کلچر اور مسائل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۸۔

۵۸۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۳ (جون ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء): ص ۱۲، ۱۳۔

۵۹۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۷ (اکتوبر ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء): ص ۱۸۔

۶۰۔ مبین مرزا "حرفِ آغاز" مشمولہ مکالمہ ش ۸ (جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء): ص ۱۴۔

۶۱۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص ۱۷۶۔

۶۲۔ مبین مرزا ''حرفِ آغاز'' مشمولہ مکالمہ ش۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء): ص ۱۲۔

۶۳۔ مبین مرزا ''حرفِ آغاز'' مشمولہ مکالمہ ش۲۱ (جنوری ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء): ص ۱۴۔

۶۴۔ جمیل جالبی، ادب کلچر اور مسائل، ص۱۸۔

۶۵۔ مبین مرزا ''حرفِ آغاز'' مشمولہ مکالمہ ش۱۱ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۱۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۲۔

باب چہارم

مکالمہ کے اداریوں میں عالمگیریت کے رجحانات کا جائزہ

باب چہارم

مکالمہ کے اداریوں میں عالمگیریت کے رجحانات کا جائزہ

عالمگیریت ایک کثیر الجہتی لفظ ہے جو کہ مختلف علوم کے ماہرین کے مطابق مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ معاشیات کی بات کی جائے تو ماہرین اقتصادیات اسے معاشی برتری اور معیشیت کا عالمی پھیلاؤ قرار دیتے ہیں، ماہرین عمرانیات کے نزدیک یہ تہذیب و ثقافت کو متاثر کر رہا ہے جبکہ کبھی اس سے سائنس اور ٹیکنالوجی کا انقلاب مراد لیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ مثبت و منفی دونوں مفاہیم کا حامل بھی سمجھا جاتا ہے۔ اُردو میں مستعمل لفظ عالمگیریت انگریزی اصطلاح (گلوبلائزیشن Globalization) کا اُردو ترجمہ ہے۔ "لغوی طور پر اس سے مراد علاقائی یا مقامی مظاہر کو عالمگیر بنانے کا عمل ہے۔"[1]

اصطلاحی معنوں میں عالم گیریت سے مراد عہد حاضر کا ایسا جدید سماجی و معاشی نظام کا قیام ہے جس کے تحت دنیا کے تمام لوگوں کے لیے یکساں زندگی کا حصول ممکن ہو سکے۔ دنیا کے تمام لوگ ایک ہی سیاسی، سماجی اور معاشی اور ثقافتی معاشرے کے تحت متحد ہو جائیں اور ایک ایسا انسانی گروہ جنم لے سکے جو یکساں انداز سے زندگی گزار سکے۔

عالم گیریت در اصل ایسا نظریہ اور تصور تھا کہ حقیقی معنوں میں ہر نوعیت کی عصبیت کا خاتمہ کر کے دنیا بھر کے انسانوں کو متحد کیا جا سکے۔ اور انفرادی ملکیت کا تصور ختم ہو۔ اجتماعی سطح پر ذرائع پیداوار، دولت، سرمایہ غرض تمام وسائل پوری دنیا کے لوگوں کے لیے یکساں انداز میں دستیاب ہوں۔ غرض عالمگیریت ایسا تصور ہے جو جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہے۔

1962ء میں عالمگیریت کی اصطلاح کو پہلی بار استعمال کیا گیا اور آغاز سے لے کر آج تک یہ اصطلاح اپنے معنی و مفہوم کی تعبیر میں کئی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ آج عالمگیریت کا مطلب و مقصد پوری دنیا پر اجارہ داری، غلبہ اور ایک عالمی حکومت کی تشکیل ہے۔ عصر حاضر میں اس کا مطمع نظر پوری دنیا پر کسی ایک مطلق طاقت کی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش ہے۔

سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تسلط اور اجارہ داری کا خواب تو انسان کی ازلی خواہش ہے اور سیاسی، معاشی و معاشرتی تسلط کے ذریعے حکومتوں کا خود کو وسعت دینے کا عمل ہمیشہ سے جاری و ساری ہے۔ ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ دنیا کے دیگر ممالک اس کے نظریات و افکار کو قبول کریں اور اس کے ماتحت کام کریں۔ کبھی جنگیں اور کبھی نو

آبادیات کا قیام بھی اسی سوچ کا نتیجہ رہا ہے۔ لیکن زمانہ حال میں عالمگیریت کا مفہوم تبدیل ہو چکا ہے۔ آج اِس خوش کن خواب کی تعبیریوں عمل میں آئی کہ اس کے فوائد ترقی یافتہ اقوام اور مضمرات ترقی پذیر یا غریب ممالک کی جھولی میں گر رہے ہیں۔

عالمگیریت کے اہداف و مقاصد کی بات کی جائے تو بظاہر اس کے مقاصد نہایت خوش کن ہیں مگر در پردہ یہ کچھ اور مقاصد لیے ہوئے ہے۔ اِس کے اعلانیہ اہداف تو یہ ہیں کہ سرمایے اور وسائل کی یکساں تقسیم ہو سکے اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماوراہو کر سرمایے کو ایک جگہ سے دوسرے جگہ منتقل کیا جا سکے۔ مختلف ممالک کی ثقافتوں کا آپس میں میل جول ممکن ہو، تاکہ مطابقت کا ماحول پیدا ہو سکے۔ دنیا کے تمام ممالک کے مابین سیاسی رکاوٹیں دور کی جائیں اور عالمی عدالت کے قیام کے ذریعے تنازعات کا حل نکالا جا سکے۔ لیکن ان مقاصد کے در پردہ اصل مقصد مغرب کی مقتدر اور برتر ریاستوں مثلاً (امریکہ) کی عالمی برتری قائم کرنے کی کوشش ہے۔ آج عالم گیریت کے نام پر امریکا اپنی اجارہ داری اور عالمی حکومت قائم کرنے کی کوششوں میں ہے۔ اور یہ تسلط اور اجارہ داری ثقافتی، معاشرتی، دفاعی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی اور اقتصادی غرض ہر پہلو سے ہے۔ عالمگیریت کا مقصد مغربی سرمایہ دارانہ نظام کا قیام ہے۔ یہ نظام تجارتی سرگرمیوں کی بلا روک ٹوک آزادی پر زور دیتا ہے۔

ممالک کے مابین تجارت پر ٹیکس کے خاتمے کی کوششیں بھی اِسی عالمگیریت کے نام پر آزاد تجارت کے لیے ہیں تاکہ امریکا جیسی عالمی طاقتیں اپنا معاشی نظام قائم کر سکیں اور پوری دنیا پر صنعتی غلبہ پا سکیں۔ عالمگیریت کے مقاصد میں ایک اور مقصد اقتصادی میدان میں ترقی پذیر اور غریب ممالک میں حکومتی سرپرستی کا خاتمہ اور عالمی طاقتوں کا کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ آئی ایم ایف جیسے عالمی ادارے اِسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں اور جیسا کہ اس ادارے کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ غریب اور پسماندہ ممالک کو قرضے کے جال میں جکڑ کر ان کی معاشی اور سیاسی پالیسیوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے اور یوں امداد اور قرضوں کے نام پر مالی غلامی کا عمل جاری و ساری رہے اور نتیجتاً اُن ممالک میں غربت کی شرح بڑھے گی۔ نیز ان پسماندہ ممالک میں افراطِ زر کا عفریت بھی اسی عالمگیریت کے عمل کا نتیجہ نظر آتا ہے۔

اِسی اقتصادی برتری کے خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عالمگیریت کے دعوے داروں نے "آزادانہ منڈی" کا تصور دیا جس کے تحت دنیا کی بڑی کمپنیوں کو تجارت میں اجارہ داری دینے کے لیے مختلف ممالک کی اقتصادی حکمت عملیوں کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر ان کے لیے تجارتی منڈیوں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پہلے ان ممالک میں اشیاء کی ضرورت و طلب پیدا کی جاتی ہے اور بعد ازاں رسد کے لیے انہیں با آسانی منڈی دستیاب ہو جاتی ہے۔ اور یوں عالم گیریت کے نام پر آزادانہ تجارت کے ذریعے مقامی صنعتوں کا

خاتمہ کر کے عالمی طاقتیں اپنے تجارتی مقاصد پورے کر رہی ہیں۔ صارفیت کا یہ کلچر عالمگیریت کا ہی ہتھیار ہے جس کے ذریعے عالمی طاقتوں کے معاشی برتری کا خواب پورا کیا جا رہا ہے۔

عالمگیریت کے اہداف میں ایک ایسی عالمی حکومت کی تشکیل کا ہدف بھی شامل ہے کہ جس میں دنیا کے تمام ممالک اس عالمی حکومت کے تابع ہو سکیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے استعماری طاقتیں (امریکا و برطانیہ) پسماندہ و ترقی پزیر ممالک کی معاشی، سیاسی اور دفاعی پالیسیوں کو اپنے انداز سے تشکیل دینے کا منصوبہ رکھتی ہیں۔ عالمگیریت کے نام پر امریکی استعمار کی آلہ کار تنظیمیں مثلاً آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک وغیرہ اِن ممالک میں اپنے پنجے گاڑ رہی ہیں بلکہ گاڑ چکی ہیں اور یوں پسماندہ ممالک کی ملکی معیشیت، سیاست، دفاع غرض سب شعبوں کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر قومی خود اختیاری کا خاتمہ کر کے امریکی تسلط کے خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانا عالمگیریت کے مقاصد میں شامل ہے۔ یعنی عالمگیریت کا ایک مقصد عالمی سیاسی برتری حاصل کرنا بھی ہے۔ اور دنیا کے دیگر ممالک کی سیاست کو اپنے کنٹرول میں رکھنا ہے۔ اِس مقصد کے لیے امریکا جیسی استعماری طاقت ترقی پذیر ممالک میں اپنی مرضی کی سیاسی قیادت کو مسلط کرتی ہے اور ان کو استحکام دے کر عالمگیریت کے مقاصد کو پورا کر رہی ہے۔ کیونکہ امریکا کی تابع سیاسی حکومتیں اس کی غلام ہوں گی۔ اور نتیجتاً بالواسطہ طور پر امریکا ہی ان ممالک میں نظام سیاست چلا رہا ہو گا اور یوں تمام دولت، وسائل اور عوام پر امریکا کا ہی قبضہ ہو گا۔

عالمگیریت کا ایک اہم ہدف دنیا سے مقامی ثقافتوں کا خاتمہ کر کے پوری دنیا پر ایک عالمی ثقافت کا غلبہ قائم کرنا ہے اور یہ عالمی ثقافت بھی مغربی ثقافت یعنی امریکی ثقافت ہی ہے جو پوری دنیا کے ممالک میں مخصوص انداز میں اپنے پنجے گاڑ رہی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جو حربہ استعمال کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے پہل امریکی ثقافت کو ایک خاص ذہن سازی کے ذریعے اعلیٰ اور برتر قرار دیا جا رہا ہے اور دنیا کے ممالک کو یہ باور کروایا جا رہا ہے کہ امریکی ثقافت ہی سب سے اعلیٰ اور بہترین ہے اور یوں مغربی ثقافت یعنی امریکی خوراک، لباس، زبان اور رسوم و رواج کو فروغ دیا جا رہا ہے تاکہ ثقافتی عالمگیریت کے ذریعے امریکی برتری قائم کی جا سکے اور یوں دنیا میں ثقافتی تنوع کا خاتمہ کر کے ایک عالمگیر ثقافت کے قیام کا منصوبہ عالمگیریت کے تصور سے ممکن ہو رہا ہے۔ امریکا جیسی عالمی طاقتوں کا عالمگیریت کے اِس خواب کو حقیقت میں ڈھالنے کا عمل جاری ہے۔ بلکہ بڑی حد تک پایہ تکمیل تک بھی پہنچ چکا ہے۔ جیسا کہ سیموئیل پی ہنٹنگٹن اپنی مشہور تصنیف تہذیبوں کا تصادم میں لکھتے ہیں:

> غیر مغربی لوگ کئی صدیوں سے معاشی خوشحالی، ٹیکنالوجیکل ترقی، فوجی طاقت اور سیاسی استحکام کے حوالے سے مغربی معاشروں سے حسد کرتے ہیں وہ اس کامیابی کا راز مغربی اقدار اور اداروں میں پاتے ہیں اور جب وہ اس کلید کے حوالے سے ایسا سوچتے ہیں تو وہ اسے اپنے معاشروں میں نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔[۲]

اس مقصد کے حصول کے لیے اہم ہتھیار سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔ ان اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی اہداف کی تکمیل کے لیے میڈیا کو اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ امریکا نے عالمی سطح پر میڈیا کی اجارہ داری حاصل کی کیونکہ عصر حاضر میں میڈیا ایک اہم عامل کا درجہ رکھتا ہے۔ عالمی طاقتیں اپنی زبان، علوم، رسم و رواج، لباس و خوراک کی تشہیر کر کے اپنی ثقافت کو فروغ دے رہی ہیں۔ الیکٹرونک، پرنٹ و سوشل میڈیا کو ثقافتی اجارہ داری کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ غرض عالمگیریت کا مقصد عالمی طاقتوں بالخصوص امریکا کا معاشی، سیاسی، ثقافتی و معاشرتی اجارہ داری قائم کر کے پوری دنیا پر راج کرنا ہے اور یہی عصر حاضر میں عالمگیریت کا مقصد ہے۔

عالمگیریت نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور یوں زبان و ادب بھی اِس کی زد میں آئے۔ عالمگیریت کے قیام کی ایک صورت ایک عالمگیر زبان کو تمام دنیا میں رائج کرنے کی پالیسی ہے اور اِسی کے نتیجے میں دیگر شعبوں پر مغربی یعنی امریکی حکمرانی کی طرح عالمگیر زبان بھی مغربی یعنی انگریزی ہی منتخب کی گئی۔ اِس کی ترویج و اشاعت کر کے اس کے فروغ کو ممکن بنایا گیا۔ انگریزی کی بطور عالمی زبان اہمیت نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ زبان میں حرفی و نحوی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان ادب میں موضوعات، اسلوب، متنوع تہذیب، غیر ملکی زبان، اور ہیئت کی تبدیلی بھی عالمگیریت کے اثرات کی مرہون ہے۔ عالمگیریت کے تحت ہی اردو ادب میں نئے نئے موضوعات شامل ہوئے۔ نئے پیکر، ہیت کے سانچے اور نئی تکنیکیں بھی عالمگیریت کے اسی عمل کا نتیجہ ہیں یعنی عالمگیریت نے اردو زبان و ادب کو فکری و فنی ہر دو انداز سے متاثر کیا۔ اور یوں دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح عالمگیریت کے زیرِ اثر ہونے والی تبدیلیوں نے اردو زبان و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ عالمگیریت کا عمل عالمی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب اور سماج و سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور یہی عمل بڑی سرعت سے ہمارے معاشرے کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ ہماری بدلتی ہوئی ملکی سیاسی و سماجی صورت حال، معاشرتی و تہذیبی روایات، اخلاقی نظام اور زبان و ادب گلوبلائزیشن کے زیر اثر ہیں۔ ہماری ہاں کئی ناقدین نے عالم گیریت کے اِس عمل کو اور اس کے ردِ عمل کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی تخلیقات میں ان عالمگیر تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے ہمارے معاشرے پر اثرات کو پیش کیا۔ اور اپنی عصری ذمہ داری پوری کی۔

مکالمہ کے اداریوں میں بھی ہمیں عالمگیریت کے اثرات اور رجحانات سے بھرپور آگہی ملتی ہے۔ مدیر مکالمہ اِس بات کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ آج عالمگیریت کے تناظر میں دنیا کی صورت تبدیل ہو رہی ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> آج ہم یک قطبی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں طاقت کے توازن کا تصور مفقود ہے اس لیے کہ اقتصادی سیاسی اور حربی اعتبار سے ایک غالب قوت یا مقتدرہ اپنی منشا اور

مفادات کے تحت اِس دنیا کی نظام سازی کر رہی ہے بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں یہ نظام بڑی حد تک اب دنیا کے مختلف خطوں میں روبہ عمل ہے اور اس کے زیر اثر دنیا کی صورت بھی بدل رہی ہے۔ یہ تبدیلی کہیں سیاسی نوعیت کی ہے تو کہیں جغرافیائی کہیں اقتصادی نوعیت کی۔[۳]

مدیر مکالمہ اردو ادب کو اس عالمگیریت سے مربوط کر کے دیکھتے ہیں اور اس کے تحت ہونے والی تبدیلیوں اور بدلتے رجحانات کو مکالمہ کے اداریوں میں موضوعِ بحث بناتے ہیں اور قاری کو بھی ان تبدیلیوں سے روشناس کراتے ہیں۔

زیر تحریر ہر باب میں دیکھا جائے گا کہ مکالمہ کے اداریوں میں عالمگیریت کے رجحانات کو کس انداز سے واضح کیا گیا ہے اور عالمگیریت کے کن مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے اور ان کی نوعیت کیا ہے؟ عالمگیریت کے علم بردار پوری دنیا میں ایک عالمی ثقافت کے قیام کے خواہاں ہیں۔ عالمگیریت کا مقصد مقتدر طاقتوں کی اپنی تہذیب و ثقافت کو پوری دنیا میں مسلط کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے جو خواب دکھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ عالمگیریت کے ماننے والے پوری دنیا میں یکساں تہذیب و ثقافت رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں موجود مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کے قریب لائی جائیں تاکہ ان کے باہم میل ملاپ سے تمام تہذیبوں کی اچھی اور قابل قدر باتوں کو عالمی سطح پر دنیا کا ہر ملک اپنائے۔ مگر یہ در اصل مغربی یعنی امریکی تہذیب کی عالمی برتری کے حصول کا منصوبہ تھا۔ جس کے تحت ایک عالمی تہذیب یعنی مغربی تہذیب پوری دنیا پر مسلط ہو جائے گی اور دنیا کی تمام تہذیبیں اپنی انفرادی شناخت و تشخص کھو دیں گی۔ اس خواب کو تعبیر کرنے کے لیے امریکا نے میڈیا کو ہتھیار بنا کر اپنی تہذیب و ثقافت کو برتر قرار دے کر پوری دنیا میں اس کے فروغ کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اور بڑی حد تک اِس میں کامیاب ہوتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ بقول سیموئیل پی ہنٹنگٹن:

تہذیبوں کے درمیان تنہا مغرب ہر دوسری تہذیب پر نمایاں اور گہرا اثر ڈال چکا ہے۔ نتیجے کے طور پر مغرب کے اقتدار اور ثقافت میں رشتہ تہذیبوں کی دنیا میں سب سے زیادہ چھایا ہوا ہے۔[۴]

اس مغربی تہذیب کی بڑھتی ہوئی یلغار نے ہمارے معاشرے کو بھی متاثر کیا۔ عالمگیریت کے اسی بڑھتے ہوئے رجحان کو مکالمہ کے شمارے 10 میں موضوع بحث بنایا گیا اور عالمگیریت کے تحت ہمارے ہاں ہونے والی مغربی ثقافتی یلغار پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ جس نے ہماری تہذیب کی بقا و تشخص کو بھی خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ بقول مبین مرزا:

اقوام اور معاشروں کی تہذیبیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں ایک پر دوسری کے سائے اس طرح منڈلا رہے ہیں کہ ان کے انفرادی جوہر اور اخلاقی و اقداری نظام تعطل کی کیفیت اور معرض تشکیک میں ہے۔ گویا تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں یا بالفاظِ دیگر مٹ رہی ہیں۔[۵]

زیر بحث اداریے میں مدیر مکالمہ نے سیموئیل پی ہنٹنگٹن کی کتاب تہذیبوں کا تصادم کا حوالہ دیا جس کے مطابق سیموئیل نے موجودہ عہد کو تہذیبوں کے تصادم کا عہد قرار دیا۔ مدیر مکالمہ بھی ان کے اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں اور عالمگیریت کے نام پر ثقافتی و تہذیبی شناخت کے خاتمے کو عصر حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ بتاتے ہیں جیسا کہ مولانا محمد یوسف اپنے ایک مضمون بعنوان "امریکی ثقافت کی عالم کاری کے ذرائع" میں لکھتے ہیں کہ:

موجودہ دور میں جس کو حقیقت کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کے ٹھیکے داروں کی یہ کوشش رہی ہے اور مستقبل میں بھی یہی رہے گی کہ ہر قوم کی تہذیب، ثقافت اور اس کے تمدن کو ختم کر دیا جائے اور پوری دنیا میں ایک ہی طرح کی تہذیب رائج کر دی جائے جو مغربی بلکہ امریکی اقدار پر مبنی ہو تاکہ دنیا اِس تہذیب کو اپنا کر اس طرح زندگی گزارے کہ مغربی مفادات میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو اور عالمگیریت اپنے تمام مقاصد میں کامیابی سے ہم کنار ہو جائے۔[۶]

کسی بھی ملک کی تہذیب و ثقافت اس کی شناخت ہوتی ہے لیکن موجودہ دور میں عالمی طاقتیں دنیا کو بے تہذیب کرنے اور ان سے ان کے نظام اقدار کو چھین کر مغربی اقدار کی ترویج اور ثقافتی تشخص کا خاتمہ کرنا چاہتی ہیں چنانچہ اس تمام صورتِ حال کا جائزہ لے کر مکالمہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ موجودہ دنیا پر عالم گیریت کا بڑھتا ہوا اثر ہمارے تہذیب و ثقافت کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

اس وقت ہماری نئی دنیا کی تمام قوموں اور تہذیبوں کے ساتھ مسئلہ آرہا ہے کہ وہ دانستہ یا نا دانستہ ایک ایسی معاشرت میں مدغم ہونے جارہی ہیں جو روایتی یا مذہبی اخلاقیات سے نا صرف عاری ہے بلکہ اس کو مسترد کرتی ہے۔ چنانچہ ہم بھی اسی ریلے میں بہے جارہے ہیں۔[۷]

ہر قوم اپنی ایک ممتاز تہذیبی شناخت رکھتی ہے۔ قوموں کی تہذیبیں اپنی انفرادی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہیں وہ انفرادی خصوصیات جو اسے دوسری تہذیبوں سے الگ اور منفرد شناخت عطا کرتی ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں شرم و حیا کا معیار اِس کی تہذیب کا حصہ اور اس ملک کی مذہبی و اخلاقی روایات کی عکاسی ہوتا ہے یہ انسانی تہذیب کے ارتقاء کی خوبصورت روایت ہے۔ پاکستانی معاشرہ جو کہ مذہب اسلام کی بنیاد پر قائم ہے اور اعلیٰ تہذیب و اقدار کا حامل ہے۔ عفت و عصمت اور شرم و حیا اس کی بہترین اقدار میں سے ایک بنیادی قدر ہے۔ اس کی بنیاد انسانی فطرت میں موجودہ شرم و حیا کے بنیادی تصور پر رکھی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالمگیریت کے تناظر

میں مذہبی و ثقافتی اجارہ داری کے مقصد کے حصول کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں تہذیبی و اخلاقی اقدار کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور شرم و حیا کا عنصر جو کہ اسلامی تہذیب کی شناخت ہے کو ختم کیا جارہا ہے اور ہمارے ہاں بھی معاشرے کا ہر فرد براہ راست اس مغربی تہذیب کے حملے کی زد میں ہے۔ ہماری اخلاقی اقدار بشمول شرم و حیا کو بطور خاص نشانہ بنایا جارہا ہے اور نتیجتاً ہماری روایات اور اقدار کمزور پڑتی جارہی ہیں۔ کیبل، ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ کو ذریعہ بنا کر ہماری عورت کو آزادی کے نام پر اپنی روایات سے منحرف کرنا ہو یا نوجوان نسل میں بے راہ روی کو فروغ دینا مغربی تہذیب ہر انداز سے فحاشی و عریانی کو عام کر کے مسلم تہذیب کو اخلاقی برتری سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ بقول اوریا مقبول جان:

> جدید تہذیب کے میڈیا نے نفسیات کے اس بنیادی طریق کار کو فحاشی و عریانی کے پھیلاؤ کے لیے اس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے کہ ہر معاشرے میں درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ فحاشی و عریانی کو عام کیا اور پھر معاشروں پر ایک ایسا وقت آیا کہ انہیں اسے دیکھنے اور اختیار کرنے میں کوئی شرم محسوس نہ ہوئی۔ حیا و شرم کو کبھی بھی ایک دم ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے آہستہ آہستہ بے شرمی اور بے حیائی کے مظاہر سے موت تک پہنچایا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی تہذیبوں کا زوال ایسے ہی آیا۔[۸]

عالمگیریت اپنے جن مقاصد کو لے کر دنیا میں روبہ عمل ہے اس کے اثرات ہماری تہذیب و ثقافت پر واضح دکھائی دیتے ہیں۔ مکالمہ کے اداریوں میں ہمارے معاشرے میں بڑھتے ہوئے فحاشی کے رجحان کو عالمگیریت کی دین قرار دیا گیا۔ مبین مرزا لکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مروج موجودہ رسم و رواج، لباس و خوراک اور زبان و ادب ہمارے صدیوں کے تہذیبی سفر کی نفی کرتے ہیں۔ "ادب، فحاشی اور معاشرہ" کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں وہ عالمگیریت کے ہمارے ہاں اثرات پر ان الفاظ میں اظہارِ تشویش کرتے ہیں:

> اپنی تہذیب اور اس کی اقدار پر سے ہمارا یقین اُٹھ گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کل تک جن باتوں کا ہمارے یہاں تصور تک محال تھا آج وہ ہماری زندگی کا معمول ہو گئی ہیں۔ اِن پر ہمیں الجھن یا تشویش ہے اور نہ ہمارے اندر ان کے خلاف کوئی احتجاج یا ردِ عمل ہے۔ ہم نے خود کو اس نئی اور بے اقدار، بے تہذیب دنیا کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔[۹]

"اکیسویں صدی میں ادب اور قاری کا رشتہ" کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں مصنف نے ادب کے زوال کی بات کی اور اس بدلتے سماجی رجحان کی وجہ عالمگیریت کو قرار دیا۔ عالمگیریت کے تمام حربوں کا آخری مقصد مغربی تہذیب و ثقافت اور اقدار کی اجارہ داری ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف طریقے اور حربے اختیار

کیے جارہے ہیں۔ قوموں کو محکوم بنا کر اور کبھی تجارت کے نام پر وہاں اپنی نو آبادیاں قائم کرنا، استعماریت کی قدیم شکل تھی۔ استعماریت کے طریقہ کار میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مغرب کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ ترقی پذیر ممالک معاشی، سیاسی و معاشرتی طور پر ان کے ماتحت رہیں۔ ماضی میں ایک ملک دوسرے ملک کو نو آبادی بنا کر ان پر اپنی تہذیب، زبان، ثقافت، لباس، رسم ورواج اور علوم وفنون مسلط کرتا تھا اور اس خطے کی افرادی قوت، ذہنی وجسمانی وملی وسائل پر قبضہ کرتا تھا۔ مگر عالمگیریت جیسا خوش کن خواب دکھا کر آج کے دور میں جدید انداز سے نو آبادیاتی نظام متعارف کروایا گیا اور اس طرح کہ کسی کو اس آفت کا احساس تک نا ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے امریکا نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنی نو آبادیات میں شامل کر کے ویسے ہی فوائد و ثمرات حاصل کرنا شروع کر دیے جو ماضی میں بڑی مشکل اور تگ ودو سے حاصل کیے جاتے تھے۔ مکالمہ کے اداریوں میں عالمگیریت کے اس رجحان کو یوں واضح کیا گیا:

> جہاں اول یا ترقی یافتہ ممالک اس یک قطبی دنیا میں اس بڑی آبادی کو آج بھی جغرافیائی طور پر ناسہی مگر ذہنی، فکری اور مالیاتی لحاظ سے اپنی نو آبادیات ہی کے درجے میں رکھنا چاہتے ہیں اس کے لیے اب وہ ایسے ذرائع اور طریقہ ہائے کار وضع اور اختیار کرتے ہیں کہ ان کی یہ برتری اور تسلط ہر ممکن قائم رہے۔[۱۰]

اور یوں جدید انداز سے نو آبادیات قائم کر کے ہم پر اپنی زبان اپنی رسوم، اپنی ثقافت اور اپنا ادب مسلط کرنے کی کوشش کی گئی اور میڈیا کو ہتھیار بنا کر افراد و معاشرے کو وقت کے بے مصرف استعمال میں الجھا دیا گیا۔

زیرِ بحث اداریے میں مصنف نے ان حربوں کی بھی نشاندہی کی جنہیں اس مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ مدیر مکالمہ نے مارکیٹ اکانومی اور مارکیٹ اسٹریٹی جیز کو عالمگیریت کا سب سے بڑا ہتھیا قرار دیا ہے اور الیکٹرونک و سوشل میڈیا کو ان کے بعد دوسرا بڑا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ثقافتی ہم آہنگی کے نام پر تہذیبی غلبے کے لیے میڈیا کے کردار کو مکالمہ کے اداریوں میں یوں واضح کیا گیا:

> آزادہ روی اور تغیر و تبدل کا یہ عمل ساری دنیا میں جاری ہے۔ ظاہر ہے ہم بھی دنیا کا حصہ ہیں لہٰذا ہم بھی اسی کی زد میں ہیں۔ ٹیکنالوجی (الیکٹرونک میڈیا) کی برکت سے کیا مشرق کیا مغرب اور کیا شمال کیا جنوب سب طرف انسانی رویوں، جذبوں اور خواہشوں میں یکسانیت پیدا ہوئی اور پوری دنیا گلوبل ویلج قرار پائی۔[۱۱]

صارفیت کا بڑھتا ہوا رجحان عالمگیریت ہی کا ایک ہتھیار ہے اس مقصد کے لیے اشیاء کی ضرورت پیدا کرنا اور پھر عالمی منڈیوں کا قیام شامل ہے۔ طلب پیدا کر کے رسد کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی تجارت اور معیشت کو مضبوط کرنا عالمی طاقتوں کا مقصود ہے اور یہ ترقی پذیر ممالک کے ذریعے پورا کیا جارہا ہے اور مدیر مکالمہ کے مطابق ہم بھی

اسی سازش کا حصہ بن چکے ہیں کہ آج بھی نو آبادیات کے درجے پر ہی ہیں۔ اور ان عالمی منڈیوں کے لیے صارف کا درجہ رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

> اس وقت دنیا کا ایک بڑا حصہ جس میں ہم بھی شامل ہیں خصوصاً جسے نو آبادیاتی دنیا کہہ سکتے ہیں یا کہ ترقی پذیر خطے اور محکوم اقوام۔ یہ سب کنزیومر سوسائٹی کے درجے میں رکھے جاتے ہیں۔[۱۲]

مالیاتی طور پر نو آبادی بنانے کے بعد عالمگیریت کا دوسرا بڑا مقصد فکری و ذہنی نو آبادی کا قیام اور کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ مدیر مکالمہ نے اس بات پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے کہ آج الیکٹرونک و سوشل میڈیا جیسے بظاہر خوش کن مگر درپردہ مہلک ہتھیاروں کے ذریعے عالمگیریت کے مقاصد کا حصول ممکن بنایا جارہا ہے۔

صارفیت کے اس بڑھتے رجحان، الیکٹرونک و سوشل میڈیا کے بے دریغ اور بلا تعطل استعمال کے نتیجے میں ادب، ادیب اور قاری سب متاثر ہوئے۔ قاری پر اس کے اثرات مکالمہ شمارہ 21 میں زیرِ بحث لائے گئے اور لوگوں میں ادب کے مطالعے کی کمی کی وجہ اسی عالمگیریت کو قرار دیا۔ اسی طرح ان اثرات نے ادیب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کو مکالمہ شمارہ 22 میں موضوع بنایا گیا کہ مدیرِ مکالمہ نے موجودہ دور میں ادیب کے اندر بے قراری، اضطراب اور بے چینی کی کیفیت اسی جدید دنیا کے بدلتے سماجی رویوں کو قرار دیا۔ اور اس سب کو عالمی طاقتوں کی کارستانی قرار دیا۔ عالمگیریت کے متعلق یہ سوال کہ آیا کہ یہ فطری عمل ہے یا باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت؟ اس کا جواب مکالمہ کے اداریوں میں یوں ملتا ہے:

> انبوہ عالم کی قلبِ ماہیت کے ایسے کام ازخود نہیں ہوا کرتے بلکہ ان کے پس منظر میں کوئی مقصد اور اس کے لیے ایک حکمت عملی ضرور ہوتی ہے۔ سو اس وقت انسانوں کی اس بڑی آبادی کو مشینی زندگی کی طرف راغب کرنے کا یہ سارا عمل دیدہ دانستہ ایک مقصد کے تحت ہے۔[۱۳]

عالمگیریت کے علم برداروں کا ایک مقصد پوری دنیا کے لوگوں کی فکر و سوچ کو بھی اپنے تابع کرنا ہے اور یہی ان عالمی طاقتوں کی اصل منصوبہ بندی ہے۔ اس مقصد کے لیے ترقی پذیر ممالک میں ذرائع ابلاغ کو اپنے ماتحت کر کے اپنی سوچ کو رفتہ رفتہ لوگوں میں منتقل کرتے ہیں۔ میڈیا کے ذریعے لوگوں کی سوچ کے دھاروں کو اپنی مرضی کے مطابق موڑا جارہا ہے۔ کوئی قوم اپنے تہذیبی ورثے اور ثقافتی تشخص کی حفاظت اسی صورت ہی کر سکتی ہے جب اسے اس کی اہمیت اور قدر کا شعور ہو۔ مگر عالمگیریت کے نام پر یہ عالمی طاقتیں افراد معاشرہ سے وہی شعور چھننے کے درپے ہیں جو انہیں سوچنے اور غور و فکر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ہم اگر زندہ ہیں؟ کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں ہمارے معاشرے میں ہماری جامد سوچ کے پیچھے وجہ بھی اسی عالمگیریت کو قرار دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک آج کا

انسان جس اضطراب، بے چینی اور بے گانگی کا شکار ہے اور غور و فکر سے دور ہے یہ در اصل سپر پاورز کی گیم ہے۔ بقول مبین مرزا:

> یہ سپر پاورز کی گیم ہے اوراس لیے ہے کہ آپ کی سوچ کے دائرے کو محدود تر رکھا جائے، آپ کے سوچنے کے انداز اور موضوعات کو determine کیا جائے، آپ کو وہ سب سمجھنے اور سوچنے سے باز رکھا جائے جو وہ نہیں چاہتے کہ آپ سوچیں اور سمجھیں۔[۱۴]

عالمگیریت کے اثرات نے جس طرح ہمارے ہاں سماج کو متاثر کیا وہ ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک کی سیاسی عدم استحکامی کی کیفیت ہے اور جس کے نتیجے میں سماجی، انفرادی بیزاری، خوف اور تشکیک کا رویہ پنپ رہا ہے۔ مدیر مکالمہ نے عالمگیریت کے اِس رجحان کو واضح کیا اور بتایا کہ عالمگیریت کے سیاسی برتری اور عالمی سطح پر ایک مقتدر طاقت کی سیاسی اجارہ داری کے مقصد نے ہمارے ہاں ہمیں بھی متاثر کیا ہے۔ حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے کے تمام عوامل طے شدہ ہیں۔ امیر کا امیر تر اور غریب کا غریب تر ہونے کا عمل باقاعدہ مقصد کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اس سب کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ آج کا انسان خوف و بے زاری کے عارضے کا شکار ہے اور اپنی اقدار سے گریزاں اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے۔ مبین مرزا ان تمام کیفیات کی وجہ بھی عالمگیریت کو قرار دیتے ہیں۔ شمارہ 40 میں "ادب اور کردار" کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں وہ دورِ حاضر میں فرد کے کردار کو موضوع بحث بناتے ہیں اور اس کی زندگی کو عالمی طاقتوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا قرار دیتے ہیں اور یہی اس دور کی حقیقت ہے کہ اس کی زندگی کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اپنے مطابق چلایا جارہا ہے اور یہ مشینی زندگی اور میکانیت ہی اس کی ذات کے بحران کا باعث بنی اور یوں عہد جدید کا انسان اپنی انفرادی شناخت سے محروم ہوتا گیا۔ بقول مبین مرزا:

> گویا اس دور میں فرد کی انفرادی شناخت کا بحران ہے واقعہ یہ ہے کہ افراد ہی نہیں خود تہذیبیں شناخت کے بحران سے دوچار ہیں۔ میکانکی یکسانیت (جو در اصل شناخت کا مٹ جانا ہے) اس گلوبل ویلج کا ایک بڑا اور سنگین مسئلہ ہے۔[۱۵]

مبین مرزا نے شمارہ 9 میں اس صورتِ حال کو عالم گیر مسئلہ قرار دیا۔ لیکن زیرِ بحث اداریے میں جہاں انہوں نے عالمگیریت کے اِس رُخ کی نشاندہی کی ہے وہیں وہ اپنے ادب کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس رجحان کی شدت ابھی اتنی بے قابو نہیں ہوئی۔ کیونکہ ادب ہی کسی سماج کا بہترین عکاس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا شمار ایسے معاشروں میں ہوتا ہے جو ابھی بھی اپنی اقدار سے سرسری ہی سہی مگر ربط قائم رکھے ہوئے ہیں۔

چنانچہ عالمگیریت کے اس رجحان کے تناظر میں وہ موجودہ دور میں ادب سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان اثرات کے آگے بند باندھنے کا کام کرے اور ادیب اس مقصد کے حصول کے لیے بنیادی عامل ہے لیکن آج کے

ادیب کے لیے دنیا کا نظارہ کیا ہے ؟ یہ بھی ایک توجہ طلب سوال ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے مکالمہ شمارہ 22 میں مصنف نے آج کے ادیب کے لیے ادب کی دنیا کا نقشہ کھینچا جو کہ ماضی سے یکسر مختلف ہے۔ اکیسویں صدی کے ادیب کی دنیا کے نام سے لکھے گئے اداریے میں مصنف نے اکیسویں صدی کو اپنے مزاج اور سرشت میں پہلے ادوار سے قطعاً مختلف قرار دیا ہے۔

مصنف نے عالمگیریت کے زیرِ اثر اس دنیا کو حقیقی نہیں بلکہ ورچول ورلڈ قرار دیا ہے۔

مکالمہ شمارہ 19 کے لیے لکھے گئے اداریے بعنوان "عصری ادب کا اضطراب" میں انہوں نے ادیب کے حالیہ رویے کو ایک بار پھر موضوع بنایا جو اس عہد جدید کے رجحانات کے سبب اپنے مقام و مرتبے سے غافل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ عصر حاضر کے ادیب کو دورِ حاضر کے رجحانات سے آگاہ کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> یہ بات بار بار سمجھنے، غور کرنے اور دہرانے کی ضرورت ہے کہ ہم آج جس عہد میں سانس لے رہے ہیں یہ قابل زمانوں اور ان کے رجحانات سے جوہری طور پر بہت مختلف ہے اس کا مزاج، رجحان، طرزِ حیات اور اندازِ نظر ہی نہیں اس کی آسائشیں اور آرائشیں، اس کی منزلیں اور گم راہیاں اس کی راحتیں اور مصیبتیں سب کچھ اس سے مختلف ہے جو اس سے پہلے کے زمانوں میں انسانی زندگی پر گزر چکا ہے۔[16]

وہ مکالمہ کے ذریعے اہل قلم کو زمانے کے بدلتے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا درس دیتے ہیں۔

عالمگیریت کے زیرِ اثر آج دنیا کا کوئی بھی ملک ناچاہتے ہوئے بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکتا اور اس عمل کا حصہ بنے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ عالمگیریت کے یہ ٹھیکے دار جہاں دنیا کی معیشیت، سیاست، اقتصادیات کی راہیں متعین کرتے ہیں وہیں یہ دنیا بھر کی تہذیب و ثقافت، اقدار و روایات اور علم و ادب کی سمت بھی متعین کرتے ہیں اور نتیجتاً اُردو ادب بھی اسی عالمگیریت کے دام میں آگیا۔ عالمگیریت کی رُو سے پہلے کا ادب اور آج عالمگیریت کے زیرِ اثر لکھا جانے والا ادب اپنے موضوعات و اسلوب، ہیت و تکنیک میں بھی مختلف دکھائی دے رہا ہے۔ مغربی رجحانات، مغربی زبانوں کے الفاظ و تراکیب اور اسلوب سے متاثر اپنی قومی شناخت کھو رہا ہے۔ ایسے میں مدیر مکالمہ "ادب میں قومیت اور آفاقیت کا مسئلہ" کے عنوان سے اداریہ لکھ کر عالمگیریت کے اس دور میں قومی ادب کے سوال کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ وہ ادب اور ادیب کے سوال قومی اور بین الاقوامی تناظر میں لکھے جانے والے ادب کا فرق واضح کرتے ہیں اور عالمگیریت کے نام پر قومی ادب کے زوال پر تشویش کا اظہار بھی کرتے ہیں ل۔ زیرِ بحث اداریے میں وہ عالمگیریت کو عصر حاضر کی سب سے بڑی حقیقت قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> عصر حاضر کے اس عالمی سماج میں انسانی زندگی کا تجربہ جتنا مقامی یا قومی ہے آج اس سے کچھ زیادہ عالمی یا بین الاقوامی ہو گیا ہے دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ روزمرہ تجربات

اور واقعات بھی ہمارے احساس کی تشکیل میں نمایاں طور سے حصہ لیتے ہیں۔ یہاں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس عالمی سطح کی زندگی کے تجربے میں مقامیت یا قومیت کی کیفیت دب کر رہ گئی ہے۔[17]

زیرِ بحث اداریے میں مصنف نے ادیبوں کے سامنے ادب کی جہت کو واضح کیا اور اس کے زمانی و مکانی تناظر کی اہمیت واضح کی۔ انہوں نے عالمگیریت کے نام پر در آنے والی اس غلط فہمی کو دور کیا کہ کوئی ادیب مقامیت سے کنارا کر کے اور قومی ادب سے دور ہو کر ہی آفاقی فن پارہ تخلیق کرتا ہے۔ لہٰذا وہ ادیبوں کو عصری اور مقامی جہت کی اہمیت سے روشناس کراتے ہوئے لکھتے ہیں: "ادب کی معنویت کا سب سے پہلا دائرہ اور اس کی قدر و قیمت کا پہلا تعین اس کی عصری و مقامی جہت ہی سے ہوتا ہے۔"[18]

وہ مستعار نظریات و خیالات اور اسلوب و بیان کو اپنے قومی تشخص سے ہم آہنگ کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ انہیں بغیر سوچے سمجھے اختیار کرنے کے حق میں نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کے دیگر شعبوں میں ہمارے اس رویے کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی یہی رویہ کار فرما نظر آ رہا ہے۔ مدیر مکالمہ نے مکالمہ کے شمارہ 24 میں عالمگیریت کا دیا ہوا نظریہ کہ ادب کو غیر جانب دار ہونا چاہیے پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور "ادب جانب دار یا غیر جانب دار" کے عنوان سے اداریہ سپرد قلم کیا۔ مصنف اس غیر جانب داری کے نظریے کو بھی بیرونی اثرات کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ جو کہ جدید انسان کا ایسا رجحان ہے جس پر بغیر سوچے سمجھے عمل در آمد شروع کر دیا گیا۔ وہ اس بات پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

ماجرا اصل میں یہ ہے کہ انسانی معاشروں میں اور خصوصاً ہمارے معاشرے میں بعض خیالات، تصورات حتیٰ کہ احساسات بھی رائج ہو جاتے ہیں، بس یوں ہی چل پڑتے ہیں کسی بھی چھان پھٹک کے بغیر۔ ایسی ساری تعلیم، ترقی پسندی اور ارتقاء بازی کے باوجود ہم نے اب تک یہ نہیں سیکھا سمجھا کہ ادھار مانگ کر قمیض، درانتی، پھاوڑے اور خچر وغیرہ سے تو کام چلایا جا سکتا ہے، خیالات و تصورات سے نہیں۔[19]

وہ ان تمام نظریات کو جو ہماری فکر و سوچ کو جامد کر کے اپنے مقاصد پورے کر رہے ہیں، تہذیب و ثقافت کے لیے مضر قرار دیتے ہیں۔ غیر جانب داری کے نعرہ لگانے والے ادیبوں اور دانش مندوں کے ہاں انفرادیت پسندی کا پنپتا ہوا رجحان بھی اسی عالمگیریت کا تسلسل ہے۔ آج کا ادیب معاشرتی دھارے کے ساتھ چلنے کی بجائے انفرادی شناخت کا خواہاں ہے اور اسی انفرادی شناخت سے اس کی مراد خارجی سوچ، خارجی اسلوب اور تکنیک و ہیت کے ساتھ ساتھ خارجی زبان کا ادب میں استعمال ہے اور عالمگیریت کے یہی اثرات اُردو ادب پر بھی ہیں۔ ان اثرات کو ڈاکٹر نجیبہ عارف ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

جب ہم اُردو زبان و ادب میں عالمی جہت کی بات کرتے ہیں تو خدشہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد کہیں وہی پچھل پیری تو نہیں جو گلوبلائزیشن کو سموپولیٹن ازم اور عالمگیریت جیسی اصطلاحوں سے جنم لیتی ہے اور بین المتنیت ادب اور ادیب کو جھوٹے دردِ زہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایسا جھوٹا درد جس کی ٹیس بھی مصنوعی ہوتی ہے اور چیخ بھی اور جس کے اظہار کے لیے منہ سے کراہ نہیں نکلتی، باقاعدہ ادب خارج ہوتا ہے۔ ایسا ادب جو مانگے کے دردوں، مستعار خیالوں اور چوری شدہ خوابوں کو ٹھونک بجا کر تیار کیا جاتا ہے۔ خیال اور موضوع سے لے کر تکنیک اور اسلوب تک سب کچھ عالمی ہوتا ہے۔[20]

کسی بھی ملک کی شناخت اس کی تہذیب و ثقافت کی بقا میں مضمر ہے۔ جو قومیں زندہ قومیں شمار کی جاتی ہیں وہ اپنی تہذیب و ثقافت اور اقدار کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی ہیں۔ مگر آج کی دنیا میں مقتدر اقوام ملکوں کی ثقافتی شناخت کو ختم کرنا چاہتی ہیں اور اس مقصد کے لیے افراد معاشرہ کو لایعنی اور فضول سرگرمیوں میں الجھا کر فکر و عمل سے دور کرنے کی سازش کی گئی اور اس سازش کا ایک نتیجہ ادب جیسی سرگرمی کا زوال بھی ہے۔ مدیر مکالمہ اسے عالمی طاقتوں کا مقصد قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ :

اس کے پس منظر میں مقتدر اقوام اور ان کے اداروں کا ایک بہت سوچا سمجھا ایجنڈا کام کر رہا ہے۔ اِس کا ایک خاص ہدف یہ بھی ہے کہ اس عہد میں انسان کو ان سب سرگرمیوں سے دور کر دیا جائے جو اس کے اندر سوالات پیدا کرتی ہیں اسے سوچنے پر اکساتی ہیں۔[21]

مکالمہ کے اداریوں میں عالمگیریت کے مقاصد کے حصول کے لیے ایک اور طریقہ کار کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اگرچہ عالمگیریت کے زیر اثر ادب واقعی روبہ زوال ہے مگر مکالمہ ادب کے زوال کی بات کو اس سازش کا حصہ بتاتے ہیں جو ترقی پزیر ممالک کو عالمگیر طاقتوں کے زیر تسلط کرنے کے لیے رچائی جا رہی ہے۔ ان کے مطابق ادب کی موت کی باتیں کرنے والے لوگ اسی سوچ کے پورے کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں وہ اسے بھی عالمی طاقتوں کی سازش قرار دیتے ہیں۔ "مفروضہ حقیقت کی دنیا اور ادب" کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں مبین مرزا لکھتے ہیں کہ:

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یہ واہمہ بھی سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کے پس منظر میں دراصل یہ خواہش کار فرما ہے کہ ان عناصر، عوامل اور فنی اصناف کو معطل اور غیر موثر بنایا جائے جو کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور اس میں بقا کی آرزو کو پروان چڑھانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ یہ دراصل ان قوتوں کی خواہش ہے جو اس دنیا کو

ایک بے تہذیب اور بے اقدار معاشرت بنانا اور اس کے انسانوں کو ایک مشینی یا
روبوٹین زندگی کے ڈھرے پر لانا چاہتی ہیں۔[۲۲]

مدیر مکالمہ نے جغرافیائی و اقتصادی فتح کے مقابلے میں انسانی ذہن کو تعمیر کرنا ہی اصل فتح قرار دیتے ہیں۔ اور نتیجتاً اس ملک کی تہذیب و ثقافت کی شناخت بھی مٹ جاتی ہے۔ آج ہمارا معاشرہ بھی اسی طوفان کی زد میں ہے۔ کسی قوم کی تہذیبی شناخت کا مٹ جانا ہی در اصل اس قوم، اس کی روایات اور اس کے تشخص کا خاتمہ کرنا ہے۔ ماضی قریب میں یہ عمل نو آبادیات کے ذریعے ممکن بنایا جاتا تھا مگر آج عالمگیریت کا نظریہ اس کی جدید شکل ہے۔ مکالمہ کے اداریوں میں دیگر تمام شعبہ جات پر اس کے عمومی اثرات کے بیان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب پر اس کے اثرات کی خصوصی طور پر نشان دہی ملتی ہے۔ مصنف نے عالمگیریت کے رجحانات کو واضح کیا کہ کس طرح ہمارا آج کا ادب اس سے متاثر ہوا ہے۔ اور بالخصوص اُردو زبان و ادب پر عالمگیریت نے کس انداز میں اثر ڈالا ہے۔ مدیر مکالمہ کے مطابق عالمی طاقتوں کا مقصد ایک مقتدر طاقت کی ثقافتی و تہذیبی برتری ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے زیر تسلط ممالک کے ادب پر کنٹرول حاصل کرنا اسی منصوبے کی کڑی ہے۔ مکالمہ کے اداریوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آج کی نظر آتی ہوئی صورت حال مثلاً انفرادی و اجتماعی سطح پر اضطراب و بے چینی، قاری کی ادب سے عدم دلچسپی، ادب کا غیر ذمہ دارانہ رویہ، اردو زبان و ادب میں غیر ضروری موضوعات، ہیت کے غیر ضروری نئے تجربات اور غیر ضروری نظریات کا داخل ہونا سب اسی مقصد کے پورا ہونے کی نشانیاں ہیں۔ مکالمہ کے اداریوں میں ان جدید رجحانات سے آگاہ کرایا گیا اور اس بات کا احساس دلایا گیا کہ ہمیں اپنی ملکی شناخت کی بقا کے لیے تہذیبی بقا کی ضرورت ہے اور مدیر مکالمہ کے مطابق ادب اِس مقصد کی تکمیل میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مدیر مکالمہ کے نزدیک ایسے ادب کی تخلیق جو لوگوں کا انحصار اپنی تہذیب و ثقافت اور اخلاق و اقدار پر مضبوط کرے آج کے دور کی اہم ضرورت ہے اور مکالمہ کی اشاعت اسی مقصد کی تکمیل سے عبارت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ http://ur.m.wikipedia.org/wiki/ ۲۳ دسمبر ۲۰۲۰ء، صبح ۱۰:۱۰

۲۔ سیموئیل فلپس، ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، مترجم محمد احسن بٹ (مثال پبلشنگ ہاؤس: ۲۰۰۳ء)، ص ۱۱۷۔

۳۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۱۸ (اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء): ص ۱۲۔

۴۔ سیموئل فلپس، ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ص ۵۳۲۔

۵۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۱۰ (جنوری تا جون ۲۰۰۳ء): ص ۹۔

۶۔ مولانا محمد یوسف، "امریکی ثقافت کی عالم کاری کے ذرائع"، ۴/ اکتوبر ۲۰۲۰ء، magazine.mohaddis.com ۲۳ دسمبر ۲۰۲۰ء، صبح ۱۰:۳۰

۷۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۱۱ (جنوری تا دسمبر ۲۰۰۳ء): ص ۱۱۔

۸۔ اوریا مقبول جان "شرم وحیا سے فحاشی و عریانی تک" مشمولہ روزنامہ ایکسپریس، (کراچی)، ۲۷ جون ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۔

۹۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۱۱ (جنوری تا دسمبر ۲۰۰۳ء) ص ۱۲۔

۱۰۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۲۱ (جنوری ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) ص ۱۳۔

۱۱۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۳ (جون ۱۹۹۸ء تا مارچ ۱۹۹۹ء) ص ۱۳۔

۱۲۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۲۱ (جنوری ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) ص ۱۳۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۸ (جولائی ۲۰۰۱ء تا جون ۲۰۰۲ء) ص ۱۴۔

۱۵۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۴۰ (ستمبر ۲۰۱۸ء) ص ۶۔

۱۶۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۱۹ (اگست ۲۰۱۰ء تا دسمبر ۲۰۱۱ء) ص ۱۲۔

۱۷۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۳۰ (مارچ ۲۰۱۷ء) ص ۵۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۔

۱۹۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۲۴ (ستمبر ۲۰۱۶ء) ص ۵۔

۲۰۔ www.sangatacademy.net/cms/ ۲۳ دسمبر ۲۰۲۰ء، صبح ۰۹:۱۰

۲۱۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۳۸ (جولائی ۲۰۱۸ء) ص ۸۔

۲۲۔ مبین مرزا "حرف آغاز" مشمولہ مکالمہ شمارہ ۲۳ (جون تا اگست ۲۰۱۶ء) ص ۸۔

ماحصل

ماحصل

اُردو زبان و ادب کی ترویج میں جہاں دیگر عناصر نے اہم کردار ادا کیا وہیں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں رسائل و جرائد کا کردار بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ رسالہ وہ تحریری جریدہ ہوتا ہے جو ایک مقررہ مدت کے بعد شائع ہوتا ہے۔ ادبی رسائل و جرائد میں ہر دور کے فکری رویوں کی عکاسی ملتی ہے کیونکہ ادب معاشرے کی فکر اور سچائی کا عکاس ہوتا ہے۔ ہر دور میں عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق، بدلتی صورت حال کے مطابق اُردو زبان و ادب کی ترویج میں رسائل و جرائد کا کردار اہم رہا ہے۔ رسائل و جرائد ادب کی تمام اصناف پر مشتمل ایسا گلدستہ ہوتے ہیں جن میں تخلیق بھی ہے، تنقید بھی اور تحقیق بھی۔ ادبی رسائل و جرائد میں ہر صنفِ ادب پر لکھا جاتا ہے۔ جہاں نثر و شاعری سے قاری کے ذوق کی تسکین ہوتی ہے وہیں علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی مضامین سے زبان و ادب میں جدید رجحانات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اور یہ معاشرے کو ذہنی و فکری طور پر مائل بہ ارتقاء بھی رکھتے ہیں۔ اور یوں ادبی رسائل ادب کی ترویج کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ برصغیر میں ادبی رسائل کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں برصغیر کے اہم ادبی مراکز سے اردو زبان و ادب کے جرائد کا سیلاب اُمڈ آیا۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور، آگرہ، حیدر آباد، بمبئی اور علی گڑھ سے جاری ہونے والے جرائد نے برصغیر کے ادبی معاشرے کی علمی و فکری بنیادیں استوار کیں۔ یہ رسائل و جرائد اپنے اندر، اپنے عہد کا شعور سمیٹے ہوئے ہیں۔ اُردو ادبی رسائل و جرائد کی روایت اخباری صحافت سے منسلک ہے۔ ابتدا میں اخبار سے خبریت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے علمی و ادبی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور آہستہ آہستہ باقاعدہ ادبی صحافت کا آغاز ہو گیا۔ اور کئی ایسے بڑے رسالے منظر عام پر آئے جنھوں نے اپنی منفرد اشاعتوں سے ادبی تاریخ پر یادگار نقوش ثبت کیے۔ ان میں جسے اولین ادبی جریدہ قرار دیا گیا وہ ماسٹر رام چندر کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ محب وطن ہے۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی اس روایت کا آغاز ہوا اور بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے برصغیر میں ادبی جریدہ نگاری ایک تحریک کی صورت میں ابھری۔ شیخ عبدالقادر کا جاری کردہ مخزن (۱۹۰۱ء) حسرت موہانی کا اُردوئے معلیٰ (۱۹۰۳ء) مولانا سلیمان ندوی کی ادارت میں جاری ہونے والا معارف (۱۹۲۶ء) میاں بشیر احمد کا ہمایوں (۱۹۲۲ء) نیاز فتح پوری کا جاری کردہ

نگار (۱۹۲۲ء) اور حکیم یوسف حسن کا نیرنگ خیال (۱۹۲۴ء) اردو کے اہم ادبی جرائد میں شمار ہوتے ہیں۔

غرض بیسویں صدی میں اردو کی مجلاتی صحافت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ ہمایوں، نیرنگ خیال، نگار جیسے عہد ساز رسائل کے بعد کئی رسالے شائع ہوئے جنہوں نے اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں ادبی دنیا، ساقی اور ادب لطیف شامل ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کئی رسائل و جرائد نے پاکستان سے اپنے اشاعتی سفر کا از سر نو آغاز کیا اور کئی نئے رسالے منصہ شہود پر آئے۔ ان میں سویرا، ماہ نو، قومی زبان، نقوش، اوراق، فنون اور ادب لطیف شامل ہیں۔

اُردو زبان و ادب کے جدید رجحانات، نثر و شاعری، اور تنقید و تحقیق کو حقیقی معنوں میں فروغ دینے میں ان رسائل و جرائد کا کردار نمایاں رہا ہے۔ اس وقت بھی برصغیر پاک و ہند سے لاتعداد رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ یہ رسائل و جرائد عصر حاضر میں ادب کی ترویج اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کتابی شکل میں اپنی اشاعت کا آغاز کرنے والا جریدہ مکالمہ بھی ہے۔ مکالمہ کراچی (پاکستان) سے شائع ہونے والا ادبی جریدہ ہے جس کے بانی اور مدیر مبین مرزا ہیں۔ ستمبر ۱۹۹۶ء میں بطور کتابی سلسلہ اپنی اشاعت کا آغاز کرنے والا یہ جریدہ اب باقاعدگی سے ماہانہ شائع ہو رہا ہے۔ امتزاجی مزاج کا حامل یہ جریدہ متنوع موضوعات پر مشتمل تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی تحریروں کا ایک خوب صورت گلدستہ ہے اور کسی خاص نظریاتی دبستان سے عدم وابستگی کی پالیسی کا علم بردار یہ رسالہ تاحال اپنی پالیسی پر قائم ہے۔ مکالمہ کا مقصد اشاعت اعلیٰ و معیاری ادب کی ترویج اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور دانش وروں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں وہ مختلف فکری و ادبی مسائل پر اظہارِ خیال کر سکیں۔ اس مقصد کا اعلان مدیر مکالمہ نے مکالمہ کے پہلے شمارے کے اداریے میں کیا۔

ہر رسالہ اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر اور واضح رجحان رکھتا ہے۔ اسی طرح مکالمہ بھی ایک واضح ادبی منشور کی عکاسی کرتا ہے۔ نظریاتی عدم وابستگی اور متنوع مواد کی اشاعت کی بدولت مکالمہ کو عہد حاضر کے ادبی جرائد میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

رسائل و جرائد میں نا صرف ادبی تخلیقات کی پیش کش ہوتی ہے بلکہ ان کے اداریہ جات بھی اس دور کی سیاسی، سماجی، فکری صورت حال کے بہترین عکاس ہوتے ہیں۔ یہ اداریے رسالے کا منشور اور اس کے نقطہ نظر کا اظہار ہوتے ہیں۔ کسی رسالے یا جریدے کی ادارتی پالیسی ہی وہ مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ جریدہ شائع کیا جاتا ہے۔ اور یہ اداریے نا صرف اس کی پالیسی کے مظہر ہوتے ہیں بلکہ اداریوں میں ملکی و قومی مسائل کی پیش کش بھی ہوتی ہے اور یہ ادب پر تنقید کا کام بھی کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ادب کے مسائل کی نشاندہی کا ذریعہ

اور ادب کی بدلتی صورت حال کے ترجمان بھی ہوتے ہیں۔ اور یوں بدلتی ہوئی عصری صورت حال کی نمائندگی کی بدولت عصری شعور کے حامل ہوتے ہیں۔

مکالمہ کے مدیر مبین مرزا ہی آغاز سے تاحال "حرفِ آغاز" کے نام سے اداریہ لکھ رہے ہیں۔ یہ اداریے مکالمہ کو ایک خاص سمت میں رکھنے اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ علم و ادب پر گہری نگاہ کی بدولت مکالمہ کے اداریے نا صرف ادبی حیثیت سے نمایاں مقام کے حامل ہیں بلکہ یہ ادب پر تنقیدی مضامین کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ان اداریوں میں ملکی و بین الاقوامی مسائل کی نشان دہی بھی ہے اور جدید رجحانات سے آگہی بھی ملتی ہے۔ یہ اداریے ادب و ادیب کی راہنمائی کا فریضہ بھی سر انجام دے رہے ہیں۔

ان اداریوں کی ادبی اہمیت کے پیش نظر ان کو موضوع تحقیق بنایا گیا۔ اور تحقیق کی بنیاد مندرج ذیل سوالات پر رکھی گئی۔

۱۔ مکالمہ کے اداروں میں عصری شعور کی عکاسی کس حد تک کی گئی ہے؟

۲۔ مکالمہ کے اداریوں میں کن ملکی و قومی مسائل کی پیش کش کی گئی ہے؟

۳۔ مکالمہ کے اداریوں میں کن بین الاقوامی مسائل کی نشان دہی کی گئی؟

۴۔ مکالمہ کے اداریوں میں معاصر رجحانات کی عکاسی اور ادبی و تنقیدی رجحانات کی پیش کش کی نوعیت کیا ہے؟

ان سوالات کی بنیاد پر مکالمہ کے اداریوں کا جائزہ لیا گیا اور مقالہ تحریر کیا گیا۔ اور حتی الامکان کوشش کی گئی کہ موضوع تک محدود رہتے ہوئے ان سوالات کے جوابات ڈھونڈے جائیں۔

ادبی رسالے پر کام کرنے سے قبل اُردو زبان و ادب میں رسائل و جرائد کی تاریخ کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس لیے پہلے باب میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں ادبی رسائل کی اہمیت کو بیان کیا گیا۔ مقالے کے سوالات اور ابواب کو مد نظر رکھتے ہوئے مکالمہ کے اداریوں کا جائزہ لیا گیا۔ مکالمہ کے اداریوں میں عصر حاضر کے مسائل کی نشاندہی بھی ملتی ہے اور عہد کے ادب کے مزاج کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں عصر حاضر کے ادبی و فکری مسائل کا پورا پورا شعور بھی ملتا ہے۔ مصنف ملکی و قومی سطح پر جن فکری مسائل کی نشاندہی کی ان میں سب سے بڑا مسئلہ موجودہ دور میں ادب کا روبہ تنزل ہونا ہے۔ مصنف نے غیر جانب داری سے ادب کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور ان تمام عناصر اور عوامل کو بیان کیا۔ جو ملکی سطح پر ادب کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ رسالے و جرائد کے اداریے ادب اور ادیب کے لیے راہنمائی کا کام بھی کرتے ہیں۔ مکالمہ کے اداریوں میں بھی ادیبوں کی راہنمائی کرتے ہوئے ان کی طرف سے ہونے والی لاپرواہیوں اور خامیوں کو بھی موضوع بحث بنایا اور یوں ادب کی خدمت کا فریضہ بھی سر انجام دیا۔ وہ ادیبوں کی نظریاتی اور سیاسی وابستگی، اور اپنے مقام و مرتبے سے غفلت کو ادب کا اہم مسئلہ سمجھتے

ہیں۔ اور ان اداریوں میں اسے اس کے مقام و مرتبے سے آگاہ کرتے ہیں اور اپنے کام سے مخلص رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

انہوں نے ان تمام مسائل کی بخوبی نشاندہی کی جن پر غور و فکر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ نیز ان اداریوں کے ذریعے سیاسی و سماجی مسائل کی بھی نشاندہی کی ہے۔ مکالمہ کے اداریوں میں بھی نا صرف عصر حاضر کے سیاسی و سماجی مسائل کی نشاندہی کی گئی بلکہ ان مسائل کے اسباب و حرکات اور ان کے پس پردہ عناصر کو بھی بے نقاب کیا گیا۔ ادب، سیاست اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب سیاست اور اس کے شعبہ جات کو متاثر کرتا ہے اور ان سے متاثر ہونا بھی ہے۔ یوں سیاسی و سماجی مسائل ادب پر اثر ڈالتے ہیں۔ ان سیاسی، سماجی مسائل کی عکاسی مکالمہ کے اداریوں میں ملتی ہے اور حکومتوں کی اقتدار کی ہوس، پارٹی بازی، انتشار کی شدت کو دورِ حاضر کے اہم سیاسی مسائل بتائے ہیں۔

مدیر مکالمہ نے ادب اور سیاست کے تعلق کو واضح کیا۔ ادیبوں کو صحافتی نمائندہ بننے کی بجائے عصری صورت حال کی غیر جانب داری سے عکاسی کا درس دیا۔ دور حاضر میں ادیبوں کی حکومتی سرپرستی کو وہ ایک مضر رجحان قرار دیتے ہیں۔ اور سرکاری سرپرستی کو ہر حال میں ادب کی آزادی کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

مدیر مکالمہ نے ادیب کو سیاسی وابستگی سے باز رہنے کا درس دیا۔ اور ادیب کے حالیہ کردار جس کے مطابق وہ ادب کو سیاسی نمائندوں کی خوشنودی، دنیاوی جاہ و ضمن کی خواہش اور مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں کو اہم سماجی مسئلہ بتایا۔

وہ ان اداریوں میں ملکی سیاسی و سماجی صورت حال کو بھی واضح کرتے ہیں جس کے مطابق دہشت گردی، خوف، عدم اعتماد جیسے مسائل معاشرے میں پنپ رہے ہیں۔ بدامنی، انتشار جیسی سماجی صورت حال میں ادب کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ اس کی وضاحت بھی مکالمہ کے اداریوں میں ملتی ہے۔ وہ ادب کو بطور معاشرتی اصلاح کا ایک ذریعہ سمجھتے اور ادیبوں کو ان خراب سیاسی و سماجی حالات میں اپنے مثبت کردار کی ادائیگی کی تلقین کرتے ہیں۔

دیگر سماجی مسائل کے بیان کے ساتھ ادبی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے کام کرنے والے اداروں کی لاپرواہی، ادبی سرگرمیوں سے دوری، اردو زبان کے فروغ و نفاذ میں حکومتی نمائندوں کی عدم دلچسپی، ادیبوں کی نمائش پسندی کی عادت اور غیر سنجیدہ رویوں کو عصر حاضر کے اہم سماجی مسائل بنایا ہے اور ان کو موضوع بحث بنا کر ان پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ عصر حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب سے ملکی سطح پر پیش آنے والے مسائل کو بھی ان اداریوں میں بیان کیا گیا۔ مصنف نے جہاں اس سائنسی انقلاب کو انسانی ترقی کا ارتقاء اور مثبت عمل قرار دیا وہیں اس انقلاب کے نتیجے میں پیش آنے والے مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا۔ مکالمہ کے اجراء کے

ساتھ ہی یعنی بیسویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے ملکی سطح پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس انقلاب نے شدت پکڑی لہٰذا اس کے نتیجے میں کئی مسائل نے بھی جنم لیا۔ ان کی نشاندہی اور ان کے اثرات کے متعلق آگہی وقت کی اہم ضرورت تھی اور یہ فریضہ مکالمہ کے اداریے بخوبی سر انجام دیتے ہیں۔ ان میں ان تمام مسائل کو بیان کیا گیا جو سائنس اور ٹیکنالوجی کا انقلاب اپنے ساتھ لائے اور پھر اپنی ادبی بصیرت سے ان کا حل بھی پیش کیا۔

وہ قومی سطح پر فکر و عمل سے دوری، ادب کے تنزل، اور اس کی قدر و قیمت میں کمی کی وجہ تفریح و فن کے ان ذرائع کو سمجھتے ہیں جو اس انقلاب کے بعد ہر فرد کی دسترس میں آ گئے۔ الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا نے کس طرح ہماری ملکی تہذیب و ثقافت کو نشانہ بنایا اسکی نشاندہی بھی مدیر مکالمہ نے بخوبی کی۔ میڈیا کی آزادی کے نتیجے میں آنے والے مسائل میں ایک مسئلہ تفریح کے نام پر پروپیگنڈہ کا فروغ ہے۔ اسی رویے نے ادب اور ادیب کو بھی متاثر کیا۔ وہ معاشرے سے احساس و شعور کے خاتمے اور مشینی و میکانکی زندگی کو بھی سائنس اور ٹیکنالوجی اور الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کی انقلابی ترقی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ معاشرے میں بڑھتے ہوئے فحاشی کے رجحان کا سبب بھی اسی کو سمجھتے ہیں۔ مصنف ان تمام مسائل کا حل معیاری ادب کی تخلیق اور اس کے فروغ کے لیے سنجیدہ کوششوں کو اختیار کرنے میں بتاتے ہیں۔

ادب کی وسعت اور بین الاقوامی اثر پزیری کی ہمیت کے پیش نظر مکالمہ کے اداریوں میں بین الاقوامی مسائل کو بھی پیش کیا گیا۔ اردو ادب بھی ہمیشہ سے غیر ملکی ادب سے متاثر ہوتا رہا ہے مگر جدت کے اس دور میں یہ اثر پذیری زیادہ شدید ہے۔ مکالمہ کے اداریوں میں عالمی سطح پر دنیا کو متاثر کرنے والے عوامل کی نشاندہی اور ان کی نوعیت اور اثرات کی شدیت کو بیان کیا گیا اور ان پر غور و فکر کی دعوت دی گئی۔

مدیر مکالمہ نے عالمی سطح پر تہذیبی تنزل، اقدار کے زوال اور ادب کی اہمیت میں کمی کو بین الاقوامی مسئلہ بنایا ہے۔ عالمی سطح پر ادب کا جمود، کسی نئی تحریک کا فقدان اور جدید انسان کی ادب سے دوری اور زندگی کے متعلق انسانی نقطہ نظر میں تبدیلی عصر حاضر کے اہم مسائل ہیں جو نا صرف ہمارے ہاں ملکی سطح پر ہیں بلکہ عالمی سطح پر دنیا کی تمام اقوام کو درپیش ہیں۔

مصنف نے دنیا میں سیاست کے شعبے کی اہمیت میں اضافہ اور ہر معاملے میں سیاسی مداخلت کو عالمی مسئلہ بتایا ہے۔ مادیت پرستی، اقتدار کی ہوس، سیاسی اجارہ داری کے حصول کی خواہش اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے طاقت کے حصول کے ذرائع مثلاً ہتھیاروں کی خرید و فروخت عصر حاضر کا اہم عالمی مسئلہ ہے۔ ان سیاسی رجحانات کی تبدیلی سے جو تبدیلی آئی عالمی سطح پر اس کے اثرات کو بھی ان اداریوں میں موضوع بحث بنایا گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے

عالمی دنیا کو جس انداز سے متاثر کیا اسے بھی موضوع بحث بنایا گیا۔

وہ انٹرنیٹ اور کیبل سسٹم کو عالمی طاقتوں کا ہتھیار قرار دیتے ہیں جس کو وہ دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ فرد کے نفسیاتی مسائل، اضطراب، بے چینی، احساس و شعور کی کمی، فحاشی و عریانی کا بدلتا معیار اور آزاد خیالی کے نام پر اقدار کو نشانہ بنایا جانا اسی سائنسی ترقی اور سائنسی ایجادات کے بے دریغ استعمال کا نتیجہ ہے۔ اور یہ عالمی صورت حال ہے۔

عہد جدید کی ایک نئی اصطلاح عالمگیریت Globalization بھی عصر حاضر کا اہم موضوع ہے۔ کئی ناقدین نے عالم گیریت کے اس عمل اور اس کے اثرات کو محسوس کیا اور اپنی تخلیقات میں ان اثرات کو پیش کیا۔ مکالمہ کے اداریوں میں بھی ہمیں عالمگیریت کے اثرات اور رجحانات سے بھرپور آگہی ملتی ہے۔ وہ اردو ادب کو عالمگیریت سے مربوط کر کے دیکھتے ہیں اور اس کے تحت ہونے والی تبدیلیوں کو مکالمہ کے اداریوں میں موضوع بحث بناتے ہیں۔

ان کے نزدیک عالمگیریت کا ایک مقصد ثقافتی و تہذیبی برتری حاصل کرنا ہے۔ عالمگیریت کے اس مقصد کے حصول کے لیے کس انداز میں مذہب اسلام کی بنیاد پر قائم مضبوط اسلامی تہذیب و ثقافت کو نشانا بنایا گیا۔ اسے مکالمہ کے اداریوں میں بیان کیا، ان اداریوں کے مطابق ہمارے معاشرے میں فحاشی کے بڑھتے ہوئے رجحان، بے راہ روی اور شرم و حیا کی صفت کا مفقود ہونا عالمگیریت کے جدید رجحانات ہیں۔ مدیر مکالمہ کے مطابق جس طرح آج سے صدی پہلے ہم برطانوی نو آبادیات تھے اسی طرح آج ہم جدید انداز سے امریکی نو آبادیات کا حصہ ہیں۔ ان اداریوں میں عالمگیریت کے مقصد کے حصول میں استعمال کردہ ہتھیاروں (عوامل) کو بھی بیان کیا گیا۔ مصنف کے مطابق معاشی برتری کے حصول کے لیے مارکیٹ اکانومی اور مارکیٹ اسٹریٹیجیز کا استعمال کر کے پسماندہ ممالک کی معیشیت کو اپنے قبضے میں کرنا عالمی طاقتوں کا مقصد ہے۔ اسی طرح سیاسی برتری اور ثقافتی اجارہ داری کا حصول بھی عالمگیریت کے مقاصد میں شامل ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے مدیر مکالمہ نے میڈیا کو سب سے بڑا ہتھیار قرار دیا ہے۔ عالمگیریت کے ان عمومی رجحانات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو زبان و ادب پر اس کے اثرات کا جائزہ بھی لیا وہ آج کی دنیا کو ادب، ادیب اور قاری کے لیے ایک یکسر اور مختلف دنیا قرار دیتے ہیں اور اس دنیا کو حقیقی کی بجائے Virtual دنیا قرار دیتے ہیں۔ اردو ادب پر عالمگیریت کے اثرات بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آج کا انسان مشینی انداز کی زندگی کا عادی ہو کر فکر و عمل سے دور ہو گیا ہے بلکہ مصنف کے مطابق عالمگیریت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اسے فضول اور لایعنی سرگرمیوں میں الجھا کر خود ایسا بنایا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ ادب سے عدم دلچسپی کی صورت میں نمودار ہوا۔ مبین مرزا ادیب کے حوالے سے اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ادیب کا اپنے مقام و مرتبے سے غافل ہونا، اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوششوں میں

مرکز سے ہٹ جانا، موضوعاتی و ہیتی سطح پر مغرب کی تقلید پسندی اور بلا سوچے سمجھے مغربی نظریات و رجحانات کی پیروی بھی عالمگیریت کے ہی اثرات ہیں۔ اور یہ تمام عالمی طاقتوں کا ثقافت کی اجارہ داری کے مقصد کے حصول کے لیے کیے جانے والی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مبین مرزا کے مطابق زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت ہی کسی ملک کا تشخص اور انفرادی شناخت ہوتی ہے۔ ملکی تشخص کی بقا کے لیے تہذیبی بقا ہر حال میں ضروری ہے اور مکالمہ کے اداریوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ادب تہذیب و ثقافت کا علمبردار اور اس کی بقا و فروغ کا اہم ذریعہ ہے۔ وہ ادب و ادیب سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جو اپنی تہذیب و ثقافت پر اعتماد کو مضبوط کرے اور مکالمہ کی اشاعت کا مقصد بھی معیاری ادب کے فروغ کے ذریعے اپنی تہذیب و ثقافت کی مضبوطی اور ترویج ہے۔ الغرض مدیر مکالمہ نے ان اداریوں میں ملکی و قومی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات کی نشان دہی اور عالمگیریت کے جدید رجحانات سے قاری کو روشناس کر کے ان اداریوں کو حقیقی معنوں میں عصری صورت حال کا ترجمان بنا دیا ہے۔ چونکہ مکالمہ ابھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ماہانہ شمارے کے طور پر شائع ہو رہا ہے لہٰذا مکالمہ کے اداریے معاصر ادبی صورت حال کو جاننے اور ملکی و بین الاقوامی صورت حال اور مسائل و معاملات کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے رہیں گے۔

کتابیات

کتابیات

احمد، ساحل۔ اُردو میں گل دستوں کی روایت۔ الٰہ آباد: ۱۹۹۸ء۔

اثبات (سہ ماہی)، ممبئی، جنوری ۲۰۱۹ء

ارتکاز، کراچی، جون تا اکتوبر ۲۰۰۷ء

انجم، سہیل۔ میڈیا اُردو اور جدید رجحانات۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء۔

آغا، وزیر۔ پہلا ورق حیدر قریشی، راغب شکیب (مرتبین)۔ کراچی: مکتبہ زبان، جنوری ۱۹۹۰ء۔

پرویز، سجاد۔ اُردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، س ن۔

جالبی، جمیل۔ معاصر ادب۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

جالبی، جمیل۔ ادب کلچر اور مسائل۔ مرتبہ خاور جمیل۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

جالبی، جمیل۔ پاکستانی کلچر۔ کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء۔

جمال، انور۔ ادبی اصطلاحات۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، س ن۔

حجازی، مسکین۔ پنجاب میں اُردو صحافت کی تاریخ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔

حجازی، مسکین۔ اداریہ نویسی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء۔

حسین، شگفتہ۔ ماہنامہ ادب لطیف کی ادبی خدمات۔ ملتان: شعبہ اُردو، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء۔

حنفی، شمیم۔ ادب، ادیب اور معاشرتی تشدد۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ طیبہ، جون ۲۰۰۱ء۔

حیدر، قرۃ العین۔ "کیا موجودہ ادب رویہ تنزل ہے؟" مشمولہ مکالمہ۔ کراچی: اکادمی بازیافت جون تا ستمبر ۲۰۰۰ء۔

راؤ، روشن آرا۔ مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء۔

رائے پوری، اختر حسین۔ ادب اور انقلاب۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء۔

روزنامہ جنگ، کراچی، ۲ مئی، ۲۰۱۸ء

روزنامہ ایکسپریس، کراچی، ۲۷ جون ۲۰۱۶ء

سدید، انور۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۶ء۔

صدیقی، ریاض۔ اُردو زبان و ادب کے مسائل۔ کراچی: نفیس اکیڈمی اُردو بازار، ۱۹۸۹ء۔

عبدالباری سید۔ روشنی بکھرتی ہے مرتبہ انتظار، نعیم۔ دہلی: ادارہ ادب اسلامی ہند، ۲۰۱۲ء۔

عبدالغنی۔ روشنی بکھرتی ہے مرتبہ انتظار نعیم۔ دہلی: ادارہ ادب اسلامی ہند، ۲۰۱۲ء۔

علی، مبارک۔ پاکستان معاشرہ۔ لاہور: تاریخ پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء۔

فنون (سہ ماہی)، لاہور، ۱۹۶۳ء

قاسمی، احمد ندیم۔ ادبی جائزے۔ مرتبہ خالد اقبال یاسر۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۶ء۔

کاسگنجوی، حسرت۔ ادب؛ علمی و فکری زاویے۔ کراچی، نفیس اکیڈمی اُردو بازار، ۱۹۹۴ء۔

کمال، اشرف۔ اُردو ادب کے عصری رجحانات کے فروغ میں مجلہ افکار کراچی کا کردار۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۸ء۔

مکالمہ (ماہنامہ)، اکادمی بازیافت، کراچی، ش (۱ تا ۴۱)، ستمبر ۱۹۹۶ء تا دسمبر ۲۰۱۸ء

مرزا، مبین۔ راقمہ سے انٹرویو بذریعہ میل۔

ہنٹنگٹن، سیموئیل فلپس۔ تہذیبوں کا تصادم مترجم محمد احسن بٹ۔ لاہور: مثال پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء۔

یاسمین شگفتہ۔ اُردو کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے۔ دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔

Websites:

https://jang.com.pk
https://Magazine.mohaddis.com
https://nlpd.gov.pk
www.express.pk
www.rekhta.org
www.sangatacademy.net

ضمیمہ جات

ضمیمہ جات

مدیرِ مکالمہ سے راقم الحروف کا سوشل میڈیا پہ لیا گیا انٹرویو:

س: ''مکالمہ'' کے اجرا کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟

ج: ''مکالمہ'' کے اجرا کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے پہلے شمارے کے اداریے میں عرض کیا تھا:

اعلیٰ اور معیاری ادب کی ترویج و اشاعت ہماری اوّلین ترجیح ہے۔ ہماری خواہش اور کوشش ہمیشہ یہی ہوگی کہ اس سلسلے کی ہر اشاعت معاصر ادب کی ایک ایسی نمائندہ دستاویز ثابت ہو جس میں ہمارے عہد کی روح اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ بولتی ہوئی سنائی دے، جس میں فکر و احساس کی تازگی بھی ہو اور زندگی کی حرارت اور توانائی بھی اور جس میں ذوقِ ادب کی آسودگی کا سامان بھی ہو اور خیال و نظر کی بالیدگی کا امکان بھی۔ مختصر یہ کہ جس کے مندرجات اردو ادب کی سمت اور رفتار و رُخ کی نشان دہی بھی کر سکیں اور زندگی کی معنویت کا سراغ بھی دے سکیں۔

علاوہ ازیں ''مکالمہ'' کے اجرا کا ایک اور مقصد ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں مختلف الخیال ادیب ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کا احترام کرتے ہوئے، مختلف فکری اور ادبی مسائل اور موضوعات پر پوری آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ آپس میں مکالمہ کر سکیں۔ اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ ''مکالمہ'' کسی مخصوص مکتبِ فکر یا دبستانِ خیال کا علم بردار یا Mouthpiece نہیں بنے گا، بلکہ اس کے صفحات پر ہم ہر مکتبِ فکر اور ہر نقطۂ نظر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی نگارشات کا یکساں طور پر خیر مقدم کریں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ نگارشات فکر انگیز، خیال افروز اور ادبی حیثیت سے قابلِ قدر اور معیاری ہوں۔ تاکہ اس روشنی کو عام کیا جائے جو اعلیٰ تخلیقات کے ذریعے وجود میں آتی ہے اور انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ بامعنی بناتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آرزو کے اس سفر میں ایسے تمام اہلِ قلم ہمارے ہم راہ اور ہم قدم ہوں گے جو ادب کو انسانیت کے ضمیر کی آواز سمجھتے ہیں اور ادبی، انسانی اور تہذیبی اقدار کے فروغ کو اپنا اہم تر فریضہ خیال کرتے ہیں۔

س: ''مکالمہ'' کے اجرا سے دنیائے صحافت اور اردو داں طبقے کی طرف سے کس طرح کا ردِ عمل سامنے آیا؟

ج: ''مکالمہ'' کی اشاعت پر بہت حوصلہ افزا ردِ عمل آیا۔ پڑھنے والوں نے بڑی کشادہ دلی سے اس کا استقبال کیا اور

ان توقعات کا اظہار کیا کہ یہ رسالہ معیاری ادب کا حامل اور اس کی ترویج و اشاعت کا کام کرے گا۔ نئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ اُس عہد کے بڑے اور نام ور ادیبوں شاعروں نے بھی اپنی نگارشات ''مکالمہ'' کے لیے بھیجیں۔ بڑے اور ممتاز اہلِ ادب وفن کی اس توجہ اور عنایت کی وجہ سے آغاز ہی میں رسالے کی بہت مستحکم شناخت قائم ہوگئی جو خدا کے فضل سے اب تک اسی طرح چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے بڑے اور معروف لکھنے والوں کی تخلیقات ''مکالمہ'' میں تواتر سے شائع ہوتی ہیں۔ رسائل و جرائد کو عام طور سے اچھے اور معیاری مواد کے حصول میں مشکل پیش آتی ہے اور اس کے لیے انھیں خاصی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ مکالمہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس قسم کے مسائل کا اسے کبھی سامنے نہیں کرنا پڑا۔

س: رسالے کے مشمولات کا تعین کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟

ج: رسالے کے لیے نگارشات قبول کرتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان میں اپنے عہد کے تخلیقی و تہذیبی شعور کا اظہار کیا گیا ہو۔ کوئی بھی ادبی تحریر سب سے پہلے اپنے جمالیاتی اظہار کی وجہ سے پڑھنے والوں کو متوجہ کرتی ہے۔ وہ انسانی تجربے، احساس، شعور اور فکر کو جس انداز سے جمالیاتی پیرائے میں بیان کرتی ہے، اسی کی وجہ سے پڑھنے والا کہتا ہے:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اگر ایسا نہ ہو تو چاہے اس میں کتنی ہی دانش وری یا فلسفیانہ اندازِ نظر کا اظہار کیا گیا ہو، وہ قارئین کی توجہ اوّل تو حاصل نہیں کرتی اور کر بھی لے تو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ پاتی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بڑا ادب دانش و بصیرت کا اظہار اگلے مرحلے پر کرتا ہے، سب سے پہلے وہ قارئین کی توجہ اور انہماک کا سامان کرتا ہے۔ ''مکالمہ'' کے صفحات ہر طرح کے نظریات اور افکار کے حامل لکھنے والوں کے لیے کھلے رہے ہیں۔ ہمیں یہ غلط فہمی بھی کبھی نہیں ہوئی کہ ہم کوئی بہت بڑا کام کر رہے ہیں اور رسالے میں صرف اور صرف ادبِ عالیہ پیش کر رہے ہیں۔ نہیں، بلکہ ہم نے صرف یہ کیا کہ جو نگارشات پڑھ کر ہمیں خود اچھی معلوم ہوئیں، ان کو ہم نے دوسروں کو بھی پڑھوانے کی کوشش کی اور رسالے میں شائع کیا۔

س: رسالے کے مشمولات کے معیار کا تعین کس طرح کیا جاتا ہے؟ مثال کے طور پر کسی خاص ادبی گروہ یا تحریک سے متعلق مصنفین کی تحریروں کے حوالے سے کچھ تحفظات بھی سامنے رکھے جاتے ہیں کیا؟

ج: ہم نے رسالے کو کبھی نظریاتی مورچہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ یہ ہم نے ضرور خیال رکھا ہے کہ ''مکالمہ'' میں

ایسا مواد نہ پیش کیا جائے جو ہماری تہذیبی، مذہبی، اخلاقی، سماجی اور قومی اقدار سے متصادم ہو۔ اس پر ہم نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا، لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ ''مکالمہ'' کے دروازے فلاں فلاں طرح کے لوگوں یا فلاں طرح کے افکار و نظریات کے لوگوں کے لیے کھلے ہیں اور فلاں فلاں کے لیے بند۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہی ادارے، رسائل اور افراد ادب و دانش کی کسی بامعنی سرگرمی میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں جو کشادگی کے حامل ہوں۔ جہاں ہر طرح کے سوال اور خیال کی گنجائش ہو۔ جہاں پوری آزادی سے اپنی بات کہنے اور مخالف نکتۂ نظر کو سننے، دیکھنے اور اس پر بات کرنے کا امکان ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور رسائل کا فکری عمل بھی جوہڑ کے کھڑے ہوئے پانی جیسا ہو جاتا ہے، جس میں تعفن ہوتا ہے۔ یوں بھی ادب اور رسائل کی ترویج و ترقی میں اختلافِ رائے نے ہمیشہ بہت اہم کردار ادا کیا۔ سوچنے اور دیکھنے کے نئے زاویے پیدا کیا ہیں۔

س: ''مکالمہ'' کو اپنے ہم عصر دیگر ادبی رسائل میں کیا انفرادیت حاصل ہے؟

ج: اس سوال کا جواب تو ''مکالمہ'' کے پڑھنے والے ہی دے سکتے ہیں۔

س: آغاز میں رسالہ التوا کا شکار رہا ہے۔ اس کی کیا وجوہات تھیں؟

ج: جب ''مکالمہ'' کی اشاعت کا آغاز کیا گیا تو خیال یہ تھا کہ سہ ماہی بنیاد پر نیا شمارہ لایا جائے گا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی ایک اہم وجہ تو یہ تھی کہ پرچے کے لیے اشتہارات کے حصول میں وقت لگتا اور دقت محسوس ہوتی تھی۔ چناں چہ اس معاملے میں کوئی زیادہ محنت نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے، یہ مزاج کا مسئلہ تھا۔ تھوڑے بہت جو اشتہارات آسانی سے مل جاتے، وہ بھی دوستوں کی ذاتی دل چسپی اور دوستی کی وجہ سے ملتے تھے، ہماری بھاگ دوڑ کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ جتنے پیسے کم پڑتے وہ ہم اپنی طرف سے ڈال کر رسالہ شائع کر لیتے تھے۔ اشاعت میں تاخیر کی دوسری وجہ کچھ اپنی سست روی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اصل میں خواہش یہ تھی کہ اچھے سے اچھا پرچہ شائع کیا جائے۔ اچھے مواد کے حصول کے لیے اچھے لکھنے والوں سے کہنا اور انھیں وقت دینا پڑتا ہے۔ یوں بھی وقت لگ جاتا۔ پھر تیسری وجہ یہ بھی رہی کہ ''مکالمہ'' شروع ہی سے کتابی سلسلے کے طور پر شائع ہوتا رہا ہے، یعنی وہ کسی پیریوڈکل سسٹم کا پابند نہیں تھا، سو دیر سویر سے اشاعت میں کوئی دباؤ نہیں ہوتا تھا۔ بس یہی سب اسباب رہے کہ پہلے دور میں اشاعت طویل وقفوں کے ساتھ ہوئی۔

س: کیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے ادبی رجحانات نے ''مکالمہ'' کے اغراض و مقاصد میں کسی حد تک تبدیلیاں پیدا کی ہیں یا نہیں؟

ج: نہیں، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ معاصر یا نئے ادبی رجحانات نے رسالے کے اغراض و مقاصد میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہے۔اس لیے کہ مکالمہ کی اشاعت کا بنیادی محرک اب بھی وہی خیال یا احساس ہے جو اس کی اشاعت کے اوّلین لمحات میں تھا۔تاہم وقت کی بدلتی ہوئی صورتِ حال میں ہم نے محسوس کیا کہ ادب، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جملہ تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں سمٹتی سکڑتی جارہی ہیں اور ہماری زندگی کے حاشیے پر آ گئی ہیں، اور معاشرے پر تہذیب کش اثرات زیادہ ہورہے ہیں اور ان کا دائرہ بھی وسیع ہورہا ہے۔چناں چہ یہ خیال ہوا کہ اس عہد میں ادیب شاعر اور ادب سے دل چسپی رکھنے والے بھی لوگ اس صورتِ حال میں تہذیبی دفاع کا ایک کردار ادا کرسکتے ہیں۔اس کی صورت یہ ہے کہ معاشرے میں ادب کے فروغ اور ترسیل کے لیے ہر ممکن کام کیا جائے۔اگر ایسا نہ کیا گیا تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ مسائل اور گمبھیر ہوجائیں گے۔انسانی سماج ایک تہذیب دشمن دور کی طرف بڑھ رہا ہے۔یہ سب محسوس کرتے ہوئے مکالمہ کو پابندی سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور اب آپ دیکھیے رسالہ پابندی سے شائع ہورہا ہے۔

س: اردو زبان و ادب کے فروغ میں ''مکالمہ'' کے کردار کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج: اس سوال کا جواب ''مکالمہ'' کے قارئین ہی دے سکتے ہیں۔

س: کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ کچھ ایسی ادبی جہات ہیں جو رسالہ ''مکالمہ'' کے توسط سے واضح طور پر ابھر کر سامنے آئی ہیں۔

ج: پہلی بات تو یہ کہ ہم نے کبھی اس پہلو پر نہیں سوچا۔اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں اس قسم کی باتیں آدمی کو خواہ مخواہ کی خوش فہمی میں مبتلا کرتی ہیں اور وہ پھر اپنے اصل کام سے غافل ہوتا اور اسی طرح کے معاملات میں مشغول ہوتا چلا جاتا ہے۔دوسری بات یہ کہ ایسے سوالات پر آپ خود بہتر انداز سے اور معروضیت کے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتے۔آدمی طبعاً خود پسند ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر کام کو کچھ بڑی چیز سمجھتا ہے۔اس لیے بہتر یہ ہوتا ہے کہ وہ نہیں، بلکہ دوسرے لوگ اس کی کارگزاری کو اس زاویے سے دیکھیں۔انھی کی بات زیادہ درست ہوسکتی ہے۔پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح کے فیصلے اس وقت کیے جاسکتے ہیں جب کوئی شخص یا رسالہ اپنا کام پورا کرچکا ہو۔جب تک کام چل رہا ہو، اُس کے بارے میں حتمی قسم کی رائے کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔

س: کیا مکالمہ کو کسی خاص طبقے کے حوالے سے منفی تنقید/تنقید برائے تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے؟

ج: دیکھیے، اہلِ بصیرت نے کچھ اس طرح کی رائے دی ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہوسکتا جسے سب اچھا سمجھیں یا

اچھا کہیں۔ اگر کچھ لوگ اسے پسند کرتے اور سراہتے تو کچھ ناپسند بھی کرتے ہوں گے۔ اسی طرح کی صورتِ حال رسائل و جرائد کی بھی ہوسکتی ہے۔ وہ بھی بعض حلقوں میں پسندیدہ ہوسکتے ہیں اور کچھ لوگوں کے نزدیک بالکل بے کار۔ ناپسند کرنے والوں کے پاس اپنا کچھ نہ کچھ جواز بھی ہوگا۔ یہ معاملہ ''مکالمہ'' کے ساتھ بھی رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ''مکالمہ'' میں چوں کہ کسی بھی قسم کی نظریاتی، سماجی یا گروہی دھڑے بندی کی کبھی کوئی گنجائش نہیں رہی اور ہم نے سب طرح کے نظری و فکری رجحان کے لکھنے والوں کو خوش آمدید کہا، اس لیے ہمیں کسی مخصوص طبقے یا خاص گروہ کی طرف سے من حیث المجموع جھگڑے یا تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

س: تحریروں کا انتخاب کرتے وقت کس قسم کی موضوعاتی یا اسلوبیاتی تقاضوں کو مدِنظر رکھا جاتا ہے؟

ج: اس حوالے سے ہم ابتدائی سوالوں میں واضح طور پر گفتگو کر آئے، سو اب اختصار سے بس یہ کہیں گے کہ ہم نے اس ادب کو خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم، ہمیشہ ترجیح دی جو انسان کے، وقت کے، زمانے کے، زندگی اور کائنات کے بارے میں ہمیں کچھ بتانے، دکھانے، سمجھانے یا سوچنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔

س: کیا پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھاریوں کو بھی رسالے میں جگہ دی جاتی ہے یا صرف پختہ لکھاری ہی اس کا معیار ہیں؟

ج: اس سوال کا زیادہ اطمینان بخش جواب آپ کو ''مکالمہ'' کے شمارے دیکھ کر مل سکتا ہے۔ ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ نئے پرانے جن لکھنے والوں سے بھی ہمیں ''مکالمہ'' کے مزاج کی نگارشات موصول ہوتی ہیں، ہم انھیں بلاتکلف اور بخوشی شائع کرتے ہیں۔

س: بحیثیت مدیر آپ رسالے کی موجودہ کارکردگی سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: سچ پوچھیے تو ہمیں قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ مکالمہ کی کارکردگی ہے کیا، اور اگر کچھ ہے تو وہ اچھی ہے یا بری۔ اس کے بارے میں ہم کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، اور یہ بات ہرگز ہرگز کسی انکسار کی وجہ سے نہیں کہی گئی، بلکہ امرِ واقعہ کے طور پر عرض کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا، ہمیں اس طرح کے سوالوں پر سوچنے کی ضرورت یا خواہش ہی نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے کام ہیں جو کرنے کے ہیں، اپنے انداز سے انھیں کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اگر کچھ کر پائے تو کارکردگی کی بابت بھی کچھ اندازہ ہوسکے گا، لیکن اس کا فیصلہ آگے چل کر ہوگا اور دوسرے لوگ کریں گے۔